ستمبر ۱۹۹۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اہمیت

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

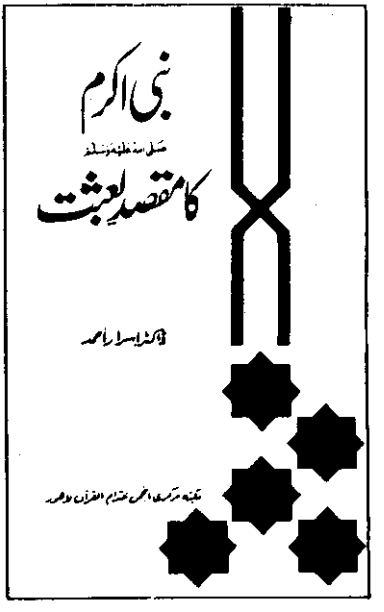

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۱۰ روپے

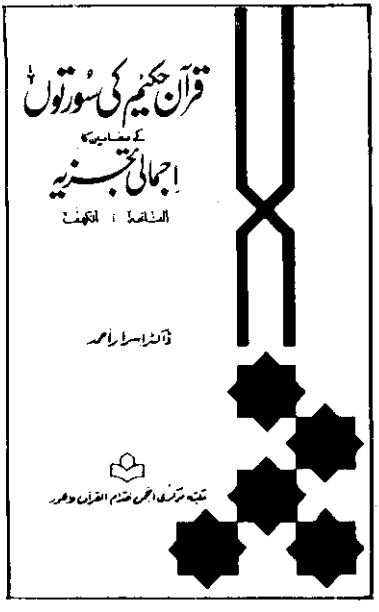

اشاعتِ خاص -۴۵ روپے، عام -۲۵ روپے

اشاعتِ خاص -/۱۶ روپے، عام -/۱۰ روپے

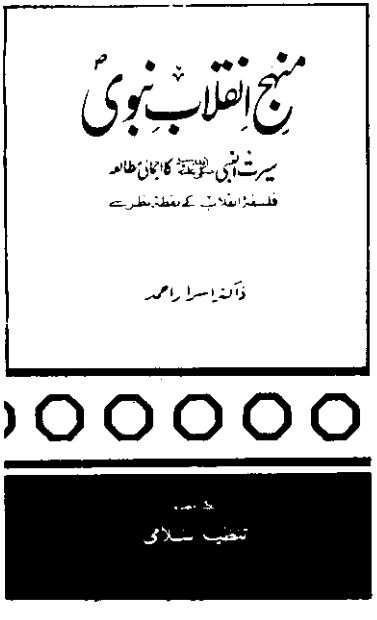

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۴۰ روپے

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۵
شمارہ: ۹
ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
ستمبر ۱۹۹۶ء
فی شمارہ ۱۰/-
سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

- ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر
- سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون: 03-02-5869501
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ **عرض احوال** ۳

حافظ عاکف سعید

☆ **تذکرہ و تبصرہ** ۵

اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اہمیت

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ **حسن انتخاب** ۳۵

کفر و گمراہی اور صراط مستقیم

علامہ محمد ناصر الدین الالبانی

☆ **کتابیات** ۵۱

نفاق کی نشانیاں (۲)

مترجم : شبیر بن نور

☆ **خطوط و نکات** ۵۸

ڈاکٹر اللہ ڈینو میمن

☆ **نظام تعلیم** ۵۹

صحیح نظام تعلیم اور پاکستان

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

☆ **گوشہ خواتین** ۷۱

تہذیب الاطفال (۴)

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

گزشتہ دنوں اپوزیشن لیڈر جناب نواز شریف کے ایک بیان کی بازگشت اخبارات کے ذریعے کانوں میں پڑی جس کی رو سے موصوف نے کسی محفل میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اقتدار میں آکر خلافت راشدہ کا نظام لائیں گے۔ نواز شریف صاحب کے منہ میں گھی اور شکر' انہوں نے ہمارے دل لگتی بات کی ہے۔ اس بیان کے ردعمل میں وزیراعظم بے نظیر صاحبہ نے جو بیان داغا اس کے اس حصے کی تو ہم بھی تائید کریں گے کہ انہوں نے پلٹ کر نواز شریف سے وضاحت طلب کی ہے کہ خلافت راشدہ کا نظام آپ نے اس وقت نافذ کیوں نہ کیا جب آپ اقتدار میں تھے!! -- تاہم خلافت راشدہ کے بارے میں وزیراعظم کے جو ریمارکس اخبارات میں شائع ہوئے وہ نہایت غیر مناسب بھی ہیں اور انتہائی قابل مذمت بھی۔

قائد حزب اختلاف کا مذکورہ بیان بظاہر کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو' ان کے سابقہ کردار یعنی ان کے دور اقتدار میں نفاذ شریعت کے معاملے میں ان کی مجرمانہ کوتاہی اور حالیہ رویہ یعنی اقتدار سے محرومی کے بعد آج کی تاریخ تک اسلام اور اسلامی اقدار کے بارے میں ان کے مجموعی رویئے کے پیش نظر ان سے خلافت راشدہ کے نظام کے احیاء کی توقع رکھنا حد سے بڑھا ہوا حسن ظن قرار پائے گا یا محض خوش فہمی۔ ہمیں حیرت ہے کہ تین سال قبل اقتدار سے علیحدہ کئے جانے کے بعد جناب نواز شریف صاحب اپنی تقاریر اور گفتگوؤں میں اسلام یا اسلامی نظام کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتے تھے۔ انہیں شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلام کے نام پر الیکشن جیت کر اقتدار میں آنا' آئی جے آئی کی حکومت میں اسلامی جماعتوں کی شرکت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے دور حکومت میں وفاقی شرعی عدالت کا سود کے خلاف فیصلہ دینا' یہ سب باتیں ان بین الاقوامی طاقتوں کو پسند نہ تھیں جو ہماری اپنی نااہلی کے باعث ہماری تقدیر کی مالک بنی بیٹھی ہیں۔ انہی جرائم کی پاداش میں وہ اقتدار سے علیحدہ کئے گئے اور پھر ناگہاں آسمان امریکہ سے معین قریشی نامی ایک گمنام شخص نے براہ راست تخت حکومت پر نزول اجلال فرمایا اور مملکت خداداد پاکستان کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ آئندہ وہ اسلام کا نام لے کر امریکہ بہادر کو دوبارہ ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ چنانچہ ایک عرصہ انہوں نے اس حوالے سے اپنی زبان پر پہرہ بٹھائے رکھا اور اسلام کے لفظ ہی کو اپنی لغت سے خارج کر دیا۔ اس تناظر میں یک بیک ان کا خلافت راشدہ کے قیام کا نعرہ لگانا ناقابل فہم ہے۔ یا تو اس درجے سکوت تھا کہ ان کے اسلام پسند ساتھیوں کو وحشت ہونے لگی تھی یا اب بولے ہیں تو کفن پھاڑ کر۔

ان کے اس نعرے کی ایک تاویل تو یہ ممکن ہے کہ حکومت کے خلاف اپوزیشن کی حالیہ تحریک اب اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ جہاں عوام کو حرکت دینے اور انہیں قربانیوں پر آمادہ کرنے کے لئے اسلام کا نعرہ لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی ہر سابقہ تحریک میں آخری حربے کے طور پر یہی نسخہ

آزمایا گیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ آزمایا گیا۔ گویا جس طرح اس سے قبل ہماری سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں اسلام کے نام کی حرمت بار بار پامال ہوئی ہے' اور سیاسی اغراض کے حصول کے لئے اسلام کے نام کو زینے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے' اسی طرح اب ایک بار پھر اس کو بٹہ لگانے کا سامان کیا جا رہا ہے۔ تاہم اس بار اسلامی نظام یا نظام مصطفیٰ کا نعرہ لگانے کی بجائے خلافت راشدہ کا نعرہ سن کر ہمارے کان کھڑے ہوئے ہیں۔

گزشتہ چند سالوں میں مختلف جماعتوں کی مساعی کے نتیجے میں جن میں سب سے زیادہ نمایاں قابل قدر حصہ تحریک خلافت پاکستان اور تنظیم اسلامی کا ہے' ملک کے طول و عرض میں خلافت کا غلغلہ کچھ بلند ہونے لگا ہے۔ نام نہاد جمہوریت کے زخم خوردہ عوام اب اس حقیقت کا ادراک کرنے لگے ہیں کہ ہمارے دکھوں کا مداوا نہ موجودہ متعفن جمہوری نظام بن سکتا ہے نہ مارشل لاء یا کوئی فوجی آمریت۔ "کافر نتوانی شد' ناچار مسلماں شو" کے مصداق ہمارے لئے امید کی واحد کرن اب نظام خلافت کی صورت میں باقی رہ گئی ہے۔ جبکہ دوسری جانب دجالی قوتوں کو اصل خطرہ خلافت کے نظام ہی سے ہے۔ ابلیس نے اپنے چیلوں کو بہت پہلے خبردار کر دیا تھا ؎

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

خلافت کا غلغلہ بلند ہونا ان قوتوں کے لئے سب سے زیادہ باعث تشویش ہے۔ چنانچہ کچھ عجب نہیں کہ جیسے اس سے قبل مختلف ذرائع سے اس ملک میں اسلام کے نام کو بدنام کیا گیا' اسی طرح اب' خلافت راشدہ کے نام کے تقدس کو پامال کرنا ان قوتوں کا اصل ہدف ہو کہ خلافت راشدہ کا عنوان لوگوں کے ذہنوں میں آج بھی انتہائی عظمت و احترام کا حامل ہے۔ گویا ؎

اک دسترس سے تیرے حالی بچا ہوا تھا اس کو بھی تو نے آخر چرکا لگا کے چھوڑا

ہمارے اس سوء ظن کا اصل سبب یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا نعرہ آج وہ شخص لگا رہا ہے جس کے دور حکومت میں اسمبلی نے جو شریعت بل منظور کیا اس میں سودی معیشت کو پورا تحفظ دیا گیا تھا' عنان حکومت جب تک اس شخص کے ہاتھ میں رہی وہ یہاں سودی معیشت کو فروغ دینے میں پیش پیش رہا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی حکومت نے سود کے خلاف وفاقی شرعی عدالت کے تاریخ ساز فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی' جس کا اپنا کاروبار از اول تا آخر سود اور سودی قرضوں پر استوار ہے۔ حالانکہ نظام خلافت میں معیشت کے میدان میں جو چیز سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور ناقابل برداشت ہو سکتی ہے وہ سود ہی ہے۔ ہاں یہ شخص اگر علی الاعلان توبہ کرے' خود اپنی ذات پر اسلام کو نافذ کرے اور اپنے کاروبار کو سودی آلائشات سے پاک کر کے قیام نظام خلافت راشدہ کا نعرہ لگائے تو کوئی نہایت مسلوب التوفیق مسلمان ہی ہو گا جو اس کا دست و بازو بننے پر آمادہ نہ ہو۔ OO

اسلامی نظم جماعت میں
بیعت کی اہمیت

اگست ۱۹۹۵ء میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا
شکاگو (امریکہ) میں ایک فکر انگیز خطاب

ترجمہ : ڈاکٹر احمد افضال

محترم خواتین و حضرات! آپ کے علم میں ہے کہ آج مجھے "اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اور اس کی اساس" کے موضوع پر خطاب کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بنیادی طور پر قرآن حکیم کا طالب علم ہوں' اور چونکہ میں اپنے فہم کے مطابق اللہ کی کتاب کے علم اور اس کی حکمت کو عام کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں' لہٰذا آپ مجھے قرآن کا معلم بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم آج کا خطاب اصلاً چند احادیثِ نبوی ﷺ کے حوالے سے ہو گا' اور صرف ثانوی درجے میں قرآنی آیات کا حوالہ آئے گا۔ یہ بات ان شاء اللہ ایک سادہ سی مثال سے واضح ہو جائے گی کہ میں احادیث کو کیوں بنیاد بنا رہا ہوں۔

سنّتِ رسولؐ سے راہنمائی

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن حکیم میں نماز کو قائم کرنے پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ اس عبادت کی اہمیت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ نماز کے تمام عناصرِ ترکیبی کا ذکر متفرق طور پر قرآن حکیم میں آیا ہے ---- جیسے قیام' رکوع' وضو اور تیمم --- لیکن نماز کی کوئی واضح شکل اور اس کا مکمل طریقہ قرآن میں کہیں نہیں ملتا۔ اقامتِ صلوٰۃ کی اہمیت تسلیم' لیکن اس کی عملی صورت کیا ہو؟ اس عملی صورت کو معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم سنّتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف

رجوع کریں۔

اسی طرح کا معاملہ میرے آج کے موضوع کا ہے۔ اسلام میں اجتماعیت کی اساس اور اس کے عملی طریقہ کار کو معلوم کرنے کے لئے سنتِ نبوی ؐ ہی سے اصل راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف عناصرِ ترکیبی کا تعلق ہے تو قرآن حکیم میں اس سے متعلق متعدد اشارے مل سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہیں کہ ہمارے سامنے اس موضوع کا ایک مکمل اور مربوط خاکہ آجائے اور اس کے عملی خدوخال واضح ہو جائیں تو یہ سنتِ نبوی ؐ کی طرف رجوع کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے میں جس روایت کی طرف آپ کی توجہات کو مرکوز کرنا چاہتا ہوں وہ مشکوٰۃ المصابیح (کتاب الامارۃ) میں مسند احمد بن حنبلؒ اور جامع ترمذیؒ کے حوالے سے موجود ہے۔ اس روایت کے الفاظ انتہائی اہم ہیں۔ حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ [اَللّٰهُ اَمَرَنِي بِهِنَّ] بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ))

"میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔ یعنی جماعت، سننا، اطاعت کرنا، ہجرت، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا"۔

میرا گمان ہے کہ آپ میں سے اکثر نے یہ حدیث پہلی مرتبہ سنی ہو گی۔ اس روایت کا تقابل اگر آپ اس انتہائی مشہور روایت سے کریں جس میں اسلام کے پانچ ارکان کا ذکر ہے تو بظاہر ایک عجیب تضاد ہمارے سامنے آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((بُنِيَ الاسلامُ عَلٰى خَمْسٍ : شَهَادَةِ اَن لا اِلٰهَ الا اللّٰه، وَاَنَّ مُحَمَّدًا رسولُ اللّٰه، وَاِقَامِ الصلاةِ، وَاِيتاءِ الزَّكاةِ، وَحَجِّ البَيتِ، وَصَومِ رمضَانَ)) (رواہ البخاری ومسلم)

"اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے : اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا

کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا"۔

آپ جانتے ہیں کہ اسلام کے پانچ ارکان کا تصور اسی حدیث سے اخذ کیا گیا ہے، اور یہ کہ یہ حدیث انتہائی عام ہے، بار بار دہرائی جاتی ہے، اور مختلف طریقوں سے اس کا حوالہ آتا ہے۔ حالانکہ اگر آپ اس روایت کے الفاظ پر غور کریں تو آپ صاف طور پر محسوس کریں گے کہ اس حدیث میں کوئی حکم نہیں دیا جا رہا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔ یہ ایک حقیقت کا اظہار تو ہے لیکن کلام انشائیہ نہیں ہے۔ کوئی واضح حکم نہیں دیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف وہ روایت دیکھئے جس کا میں نے حوالہ دیا ہے، اس میں صریح الفاظ اور انتہائی تاکیدی اسلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پانچ باتوں کا حکم دیا ہے، یعنی جماعت، سمع و طاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔ اس کے باوجود یہ حدیث وہ ہے جس سے لوگ بالعموم واقف نہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اس روایت کے وجود ہی سے بے خبر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بے خبری کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔

اس موقع پر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کروں۔ یہ تقریباً ۲۰ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میرا اس حدیث کے ساتھ تعارف مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی مرحوم کے ذریعے ہوا۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں اپنے جریدے "الہلال" میں اور مولانا مودودی نے ۱۹۴۶ء میں مراد پور (سیالکوٹ) کی ایک تقریر میں (جو "شہادتِ حق" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے) اس حدیث کا حوالہ دیا تھا۔ لیکن دونوں نے اس روایت کی سند کا ذکر نہیں کیا، یعنی یہ حوالہ نہیں دیا کہ یہ حدیث کس کتاب سے لی گئی ہے۔ مجھے اس روایت میں خاص دلچسپی تھی اور اسی تجسس کی وجہ سے میں نے ایک بڑے عالم دین سے رابطہ قائم کیا جو لاہور کے ایک دینی ادارے میں شیخ الحدیث تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے اس حدیث کے ماخذ اور اسناد سے متعلق سوال کیا۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ اس روایت کے الفاظ نامانوس سے محسوس ہو رہے ہیں، مجھے یاد نہیں کہ یہ الفاظ میری نظر سے گزرے ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ حدیث، جیسا کہ میں نے عرض کیا، مشکوٰۃ میں موجود ہے، جو علمِ حدیث کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ایک

عالم نے، جو علمِ حدیث کے استاد اور اپنے فن میں ماہر سمجھے جاتے ہیں، اس روایت کو نامانوس قرار دیا۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ ایک نہایت اہم روایت عام مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ علماء کے شعور سے بھی محو ہو گئی! اس وجہ کو سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

اسلام "مذہب" کیونکر بنا؟

اسلام عام معنوں میں مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ مذہب کا لفظ عموماً نہایت محدود مفہوم میں مستعمل ہے، یعنی چند عقائد (dogma)، پرستش یا عبودیت کے طریقے (rituals)، اور چند سماجی رسومات (social customs)۔ اس سے زیادہ یا اس سے آگے بڑھ کر مذہب کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی جاتی۔ چنانچہ جہاں تک سماجی، معاشی اور سیاسی نظام کا تعلق ہے تو آج کے دور میں یہ مان لیا گیا ہے کہ ان تمام امور کا کوئی تعلق کسی مذہب یا کسی آسمانی ہدایت سے نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے برعکس ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا دین ---- دین اسلام --- ایک مکمل نظام حیات فراہم کرتا ہے اور یہ کہ اس میں ذاتی اور اجتماعی زندگی دونوں کے لئے مکمل ہدایات موجود ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمان امت کے زوال کی وجہ سے یہ بنیادی حقیقت بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے زوال کا جو عمل شروع ہوا وہ رفتہ رفتہ یہاں تک پہنچا کہ دین کا یہ مفہوم کہ وہ ہمیں ایک کامل سماجی، معاشی، اور سیاسی نظام بھی فراہم کرتا ہے، ہمارے اجتماعی شعور سے محو ہو گیا اور ہم اسلام کو بھی معروف معنوں میں صرف ایک مذہب سمجھنے لگے۔

اس سلسلے میں مغربی استعمار کی غلامی کا بھی اہم کردار ہے۔ یہ وہ دور تھا جب عیسائیت جیسے "مذہب" سے ہمارا سابقہ پیش آیا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مسیحیت میں کوئی قانون یا شریعت نہیں ہے۔ پورا مذہب محض چند عقائد، چند اخلاقی تعلیمات اور تھوڑے بہت تصوف پر مشتمل ہے۔ نظام اجتماعی کی بات تو بہت دور کی ہے، مسیحیت میں تو کوئی قانون تک موجود نہیں ہے۔ مغرب کی غلامی کے دور میں ہم نے بھی یہی لفظ یعنی

"مذہب" اختیار کر لیا' اور باوجودیکہ اس کا اصل انطباق تو مسیحیت پر ہوتا ہے' ہم نے اسلام کو بھی ایک "مذہب" کہنا اور سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان ملکوں پر مغربی قانون اور استعماری نظام کا غلبہ تھا' نظامِ اجتماعی کے کسی بھی گوشے کا تعلق اسلام سے باقی نہ رہا تھا' بلکہ ہر کام ہمارے غیر ملکی آقاؤں کی مرضی کے مطابق ایک لادینی نظام کے تحت ہوتا تھا۔ نظام اسلام جب ایک ٹھوس اور واقعی حقیقت کی صورت میں موجود نہ رہا تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق دین کا یہ تصور کہ وہ ایک مکمل نظام بھی ہے ہماری نظروں سے غائب ہو گیا۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک مکمل اور قابل عمل سیاسی' سماجی اور معاشرتی نظام بھی ہے تو بہت سے مسلمان بھی چونک جاتے ہیں۔

صدیوں کے مسلسل زوال کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کا بحیثیتِ دین تصور ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چنانچہ مغربی استعمار کی غلامی کے دور میں بھی ہم مسلمانوں کو عقائد' نماز' روزے' زکوٰۃ' حج وغیرہ کی پوری آزادی تھی۔ ہمیں اجازت تھی کہ بچے کی پیدائش پر عقیقہ کریں' شادی کے موقع پر نکاح کا طریقہ اختیار کریں' فوتیدگی کی صورت میں تجہیز و تکفین کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تمام چیزیں ---- عقائد' عبادات' رسومات ---- تو ہماری نظروں میں رہیں' لیکن چونکہ اس دورِ غلامی میں ہمارا سماجی' معاشی اور سیاسی نظام برقرار نہ رہا' لہٰذا اسلام کے یہ پہلو ہمارے اجتماعی شعور سے غائب ہو گئے۔

ہجرت کا وسیع تر تصور

اب میں چاہوں گا کہ زیر بحث حدیث کے الفاظ پر غور کر لیا جائے۔ حضور ﷺ نے جن پانچ باتوں کا حکم فرمایا ہے ہم ان کو عکسی ترتیب سے سمجھنے کی کوشش کریں گے' جس کی وجہ آگے چل کر واضح ہو جائے گی۔ آخری دو باتیں ہیں ہجرت اور جہاد۔ یہ دونوں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اکثر ہم کسی بات کے منفی پہلو کو پہلے بیان کرتے ہیں اور مثبت کو بعد میں۔ مثلاً لا الٰہ الا اللہ میں بھی نفی پہلے ہے' اثبات بعد میں۔ پہلے تمام خداؤں کی نفی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے۔ اسی طرح

آپ دیکھیں گے کہ ہجرت ایک ہی حقیقت کا منفی پہلو ہے اور اسی فریضہ کے مثبت پہلو کا نام جہاد ہے۔ ہجرت کا مطلب ہے کسی شے کو ترک کر دینا اور جہاد کا مفہوم ہے کسی شے کے لئے کوشش کرنا۔ چنانچہ یہ دونوں فرائض حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

ہجرت اور جہاد دونوں کے کئی مراحل اور درجات ہیں' لیکن میں آپ کے سامنے ان دونوں فرائض کے ابتدائی اور پھر آخری مراحل بیان کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ ابتدائی اور آخری مراحل سمجھ لینے کے بعد آپ درمیانی مراحل کا اندازہ خود ہی لگا لیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار یہ سوال پوچھا گیا کہ کون سی ہجرت سب سے افضل ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ سب سے افضل ہجرت یہ ہے کہ تم ہر اس شے کو چھوڑ دو جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔ (رواہ النسائی' عن عبداللہ بن عمرو) اب آپ ذرا اس حدیث مبارک کے نتائج پر غور کریں۔ اگر کوئی شخص آج یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ ہر اس شے کو ترک کر دے گا جو اللہ کو پسند نہیں تو گویا آج ہی سے اس کی "ہجرت" کا آغاز ہو جائے گا۔ اگر اس کے کاروبار میں سود کا کوئی حصہ ہے تو اسے چھوڑنا پڑے گا اور اگر اس کی معاشرت میں کہیں احکام شریعت سے تجاوز ہو رہا ہے تو اس طرز معاشرت کو ترک کرنا پڑے گا' خواہ اس شخص کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کے استہزاء بلکہ مخالفت ہی کا نشانہ کیوں نہ بننا پڑے۔ چنانچہ ہجرت کا پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ انسان ہر اس شے کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

اب اس نکتے کو سمجھئے کہ ہجرت کا آخری مرحلہ یا ہجرت کے عمل کا نقطہ عروج کیا ہے؟ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد ہم سب پر فرض ہے۔ اگر اس جدوجہد کے دوران ایسا موقع آ جاتا ہے کہ وطن اور گھر بار چھوڑ کر کسی خاص مقام پر جمع ہونے کی ضرورت پیش آ جائے تاکہ باطل کے خلاف آخری حملے کے لئے قوت فراہم کی جا سکے تو یہ ہجرت کی انتہائی شکل ہو گی۔ اگر ایسا موقع آ جاتا ہے تو ہر اس شخص کے لئے جو اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف ہو' یہ لازم ہو گا کہ وہ اپنے گھر' اپنی جائیداد' اپنے دوستوں اور رشتہ

داروں بلکہ اپنے محبوب وطن تک کو چھوڑ کر اللہ کے دین کے لئے نکل آئے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نقل مکانی اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے یا کسی بہتر اور آسودہ ماحول کی تلاش کے لئے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضاجوئی کے لئے ہوگی۔

اس ہجرت کا تصور کیجئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم نے مکے سے مدینے کی طرف فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنے گھروں اور اپنے مال و متاع کو چھوڑا' اپنے آباء و اجداد کا شہر چھوڑا' انہوں نے وہ سرزمین چھوڑی جہاں ان کے باپ دادا کی ہڈیاں دفن تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے دنیا کا سب سے قیمتی اور مقدس مقام' خانہ کعبہ' تک چھوڑ دیا۔ تصور کیجئے کہ یہ ہجرت کس غرض کے لئے تھی؟ کیا یہ لوگ اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا چاہتے تھے؟ کیا انہیں بہتر کاروباری مواقع کی تلاش تھی؟ کیا وہ دولت و جائیداد کے اعتبار سے پھلنا اور پھولنا چاہتے تھے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی شے بھی ان کو مطلوب نہ تھی۔ ان کی یہ ہجرت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تھی' اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے سامنے نہ تھا۔

جہاد کے مختلف مراحل

اب اس تصویر کے دوسرے رخ پر اپنی توجہ کو مرکوز کیجئے۔ جہاد کا پہلا مرحلہ کیا ہے اور اس کی آخری منزل کون سی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا جہاد سب سے افضل ہے؟ حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس کے خلاف کشمکش کرو اور اسے اللہ تعالیٰ کا مطیع بنا دو۔ اسی طرح ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا : اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ نفس سے کیا مراد ہے؟ انسان کے وجود میں ایک شے تو اس کی فطرت ہے جو اس کی روح سے عبارت ہے' اور دوسرا اس کا نفسِ حیوانی ہے جو اس کے جبلی تقاضوں سے عبارت ہے۔ یہ حیوانی اور جبلی تقاضے اندھے ہیں' انہیں حرام و حلال سے غرض نہیں' بلکہ صرف اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان خواہشات کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان لامحالہ گناہ اور فسق و فجور کے راستے پر پڑ جاتا ہے' لہٰذا لازم ہے کہ ہم ان

خواہشات کے خلاف کشمکش کریں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع بنائیں۔ یہ کوشش اصل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق جہاد کی پہلی سیڑھی ہے۔

اب اس بات کو سمجھئے کہ جہاد کا آخری مرحلہ یا جہاد کا نقطہ عروج کیا ہے؟ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد ہم سب پر فرض ہے۔ اگر اس جدوجہد کے دوران ایسا موقع آ جاتا ہے کہ ہر وہ شخص جو اس جدّوجہد میں مصروف ہو اس کے لئے لازم ہو جائے کہ وہ کفر اور شرک کی طاقتوں کے خلاف لڑنے کے لئے میدان میں آجائے تو یہ جہاد کا آخری مرحلہ ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر ایک مسلمان اس حال میں مرجاتا ہے کہ اس نے نہ تو اللہ کی راہ میں کسی جنگ میں حصہ لیا اور نہ اس کے دل میں اس کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ ایک قسم کے نفاق کی حالت میں مرا۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارہ : عن ابی ہریرہؓ) حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ایمانِ حقیقی حاصل ہو اور اسے یہ علم ہو کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد اس پر فرض ہے، تو یہ آپ سے آپ لازم آجاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کی ایک شدید خواہش بھی اس کے دل میں موجود ہو۔ البتہ یہ عین ممکن ہے کہ اس شخص کی زندگی میں ایسے مسلح تصادم کا موقع ہی نہ آئے۔ جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہ ایسے تھے جو ہجرت سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ گویا ان کی زندگیوں میں قتال فی سبیل اللہ کا موقع ہی نہیں آیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس راہ میں لڑنے کی شدید آرزو ان کے دلوں میں یقیناً موجود تھی۔ اس لئے کہ اگر یہ آرزو کسی کے دل میں موجود نہ ہو تو اس کے ایمان ہی کی نفی کر دی گئی ہے۔

ہجرت و جہاد کی شرطِ لازم : التزامِ جماعت

یہاں یہ سوال اپنے سامنے رکھئے کہ کیا ہجرت اور جہاد کے یہ فرائض ایک منظم اور متحد جماعت کے بغیر بھی ادا کئے جا سکتے ہیں؟ کیا کوئی شخص اپنی انفرادی حیثیت میں ہجرت اور جہاد کا حق ادا کر سکتا ہے؟ آپ اپنے نفسِ امارہ کے خلاف تو کشمکش تمارہ کر بھی کر سکتے ہیں، لیکن کیا اللہ کے دین کی اقامت اس طرح ممکن ہے؟ کیا کوئی فرد اپنی ذاتی حیثیت میں اتنا طاقتور ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو محض اپنے زورِ بازو سے نافذ کر

سکے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب صرف نفی میں ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اگر ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرنا ہے تو یہ کام ایک منظم جماعت کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے تو یہ فرض ایک منظم جماعت کے بغیر محض انفرادی طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا' اس کے لئے ایک جماعت کا ہونا لازم ہے۔ چنانچہ زیر مطالعہ حدیث میں یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ حضور ﷺ نے سب سے پہلے جس بات کا مسلمانوں کو حکم دیا وہ التزامِ جماعت ہے۔ یعنی مسلمانوں کے لئے یہ شے لازم کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو ایک جماعت کی شکل میں منظم رکھیں۔ یہ جماعت اور اس کا نظم اس لئے مطلوب ہے کہ آخری دو فرائض یعنی ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کو کماحقہ' ادا کیا جا سکے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت کے لئے میں چاہوں گا کہ آپ کے سامنے چند اور احادیث بھی آ جائیں جن میں جماعت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

امام ترمذیؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا :

((عَلَيكُم بِالجَمَاعَةِ' وَاِيَّاكُم وَالفُرقَهِ' فَاِنَّ الشَّيطَانَ مَعَ الوَاحِدِ' وهومِنَ الاِثنَينِ اَبعَدُ)) (رواہ الترمذی)

"تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے' اور تم تنہا مت رہو' اس لئے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے' لیکن اگر دو (مسلمان) ساتھ رہیں تو وہ دور ہو جاتا ہے۔"

اس حدیث میں حضور ﷺ نے مسلمانوں کو واضح طور پر خبردار کیا ہے کہ اگر ایک مسلمان جماعت سے الگ رہتا ہے تو شیطان اسے اپنا شکار بنا لیتا ہے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا ہے۔

ایک دوسری روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا :

((يَدُاللّٰهِ عَلَى الجَمَاعَةِ' وَمَنْ شَذَّ شَذَّ اِلَى النَّارِ)) (رواہ الترمذی)

"اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ جو شخص خود کو جماعت سے کاٹ لیتا ہے وہ آگ میں ڈالا جائے گا"

مراد یہ ہے کہ اللہ کی مدد اور حمایت مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے ہے نہ کہ افراد کے لئے۔ اگر ایک شخص اجتماعیت سے خود کو کاٹ لیتا ہے تو پہلی حدیث کی رُو سے وہ شیطان کے لئے نرم چارہ ثابت ہوتا ہے جو اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا ہے۔ اور اس طرح آخرت میں ایسا شخص جہنم کا مستحق بنتا ہے۔

اس سلسلے کی تیسری روایت اصل میں حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے (اور علم حدیث کی رو سے یہ بھی "حدیث" ہی ہے)۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :

((اِنَّہٗ لَا اِسلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ وَلَا جَمَاعَۃَ اِلَّا بِاِمَارَۃٍ وَلَا اِمَارَۃَ اِلَّا بِطَاعَۃٍ)) (رواہ الدارمی)

"یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے' اور امارت کے بغیر جماعت نہیں ہے' اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت بھی نہ ہو"۔

دین میں اجتماعیت کی اہمیت

آگے بڑھنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے ہمارے دین کے مزاج کی ایک جھلک آجائے۔ میں نے شروع میں اس اہمیت کی طرف اشارہ کیا تھا جو ہمارا دین نماز کو دیتا ہے۔ مَردوں کے لئے فرض نمازیں باجماعت ادا کرنا لازم کیا گیا ہے' سوائے اس کے کہ کوئی حقیقی عذر لاحق ہو۔ جماعت کی شکل میں نماز ادا کرنا دراصل اس امر کی ایک علامت ہے کہ اسلام تمام معاملات میں ایک طرح کا عمومی نظم چاہتا ہے۔

باجماعت نماز میں کیا ہوتا ہے؟ ایک امیر یا امام ہے جس کی تمام نمازیوں کو پیروی کرنا ہوتی ہے۔ کسی نمازی کو اجازت نہیں کہ وہ نماز کا کوئی رکن امام سے پہلے ادا کرلے۔ اگر کوئی شخص امام سے پہلے اپنا سر سجدے سے اٹھالے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ انتہا یہ ہے کہ اگر امام نماز پڑھانے میں کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے تو آپ کو اس کی اجازت تو ضرور ہے

کہ سبحان اللہ کہہ کر اسے متوجہ کریں، لیکن اگر وہ اپنی غلطی پر قائم رہتا ہے تو آپ کو جماعت چھوڑ دینے کی ہرگز اجازت نہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ کو سو فیصد یقین ہو کہ امام سے غلطی کا صدور ہو رہا ہے تب بھی آپ جماعت چھوڑ کر الگ نہیں ہو سکتے، بلکہ ضروری ہے کہ آپ لازماً جماعت کے ساتھ رہیں اور امام کی غلطی میں بھی اس کی پیروی کریں۔ جماعت کی اہمیت یہ ہے کہ آپ کو اس کے ساتھ اپنے آپ کو پیوستہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے خواہ آپ اپنے امام سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔

دوسری مثال اسلام کے سماجی نظام سے لیجئے، جس کی بنیاد "نکاح" کے ادارے کے ذریعے استوار ہوتی ہے۔ نکاح کیا ہے؟ ایک عورت اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ وہ شریعت کے دائرے کے اندر اندر اپنے شوہر کی اطاعت کرے گی اور اپنے آپ کو نکاح کے لئے پیش کرتی ہے۔ ایک مرد اس پیشکش کو قبول کرتا ہے اور اس طرح نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ فی الواقع اگر آپ کو ایک مضبوط اور صحت مند خاندانی نظام تشکیل دینا ہے تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اطاعت فی المعروف اور نظم کو بھرپور طریقے سے قائم کیا جائے۔ اسی لئے اسلام نے بیوی پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ بیوی اپنے شوہر سے اختلاف کر سکتی ہے، اس کی رائے بدلنے کی کوشش کر سکتی ہے، وہ اپنے شوہر کو مشورہ یا تجویز دے سکتی ہے، وہ دلائل کے ذریعے بات کر سکتی ہے یا استدعا اور درخواست کر سکتی ہے، لیکن اگر وہ اپنے شوہر کی اطاعت پر کاربند نہیں تو یہ رویّہ اسلامی تعلیمات کے منافی سمجھا جائے گا۔

ایک تیسری مثال لیجئے۔ حضور ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اگر دو افراد بھی اکٹھے سفر کر رہے ہوں تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنے میں سے زیادہ تجربہ کار اور باعلم شخص کو امیر مقرر کر لیں، جو دوسرے مسافر کی رہنمائی کرے۔ اسی طرح اگر دو افراد ساتھ ہوں اور نماز ادا کرنے کا موقع آجائے تو ان میں سے ایک کو امام بن جانا چاہئے اور دوسرے کو مقتدی۔ ان مثالوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں اجتماعیت کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ نیز ان سے اسلام میں اجتماعی زندگی کے نظام پر روشنی پڑتی ہے، جو ہمارا اگلا موضوع ہے۔

نظمِ جماعت کی مختلف شکلیں

اسلام میں اجتماعی زندگی کے مزاج کو درست طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے اس نظام کا خاکہ بھی رہے جو دنیا میں عموماً اختیار کیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں کئی طرح کے ادارے، جماعتیں، انجمنیں وغیرہ قائم کی جاتی ہیں۔ یہ سب اجتماعیت ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دو امور نہایت اہم ہوتے ہیں، اولاً تاسیسی یادداشت جس میں اس ادارے، جماعت یا انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کئے جاتے ہیں اور ثانیاً اس کا دستور۔ جہاں تک دستور کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ قریب قریب ایک جیسے قواعد و ضوابط ہیں جو مختلف قسم کے اداروں کے دساتیر میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ رکنیت کی شرائط ہوتی ہیں۔ پھر ارکان کسی صدر یا چیئرمین کو منتخب کرتے ہیں۔ پھر مجلس عاملہ یا شوریٰ کے انتخاب کے لئے قواعد ہوتے ہیں۔ آخر میں اختیارات کی تقسیم کا معاملہ طے کیا جاتا ہے اور Checks and balances کا نظام وضع ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعتیں نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی ہیں۔ اس طریق کار میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جسے قرآن یا سُنّت کی بنیاد پر غلط کہا جا سکے۔ تنظیم یا اجتماعیت کی یہ صورتیں قطعی طور پر جائز اور مباح ہیں۔

جو نکتہ میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگرچہ جماعت سازی کا یہ نظام جو آج دنیا میں عام طور پر پایا جاتا ہے خلافِ اسلام نہیں ہے، تاہم اس نظام کے حق میں کوئی دلیل نہ قرآن مجید سے ملتی ہے اور نہ سنّتِ رسول ﷺ سے۔ اس کے باوجود میری رائے یہی ہے کہ یہ طریقہ غیر اسلامی یا غیر شرعی ہرگز نہیں۔ یہ رائے دراصل فقہ کے ایک بنیادی اصول پر مبنی ہے، یعنی ہر کام مباح اور جائز سمجھا جائے گا جب تک کہ اس کا حرام ہونا کسی شرعی دلیل سے ثابت نہ کر دیا جائے۔

اس کے برعکس جماعت سازی کا جو طریقہ ہمیں قرآن پاک سے ملتا ہے، جو حضور ﷺ کی سیرت اور سنت سے ملتا ہے اور جو امّتِ مسلمہ کی ۱۴ سو سالہ تاریخ میں ملتا ہے وہ اس طریقے سے بالکل مختلف ہے جو آج کی دنیا میں عموماً رائج ہے۔

اسلامی اجتماعیت کی دو بنیادی اصطلاحات

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی اجتماعیت سے متعلق بعض بنیادی اصطلاحات کو سمجھ لیا جائے۔

۱۔ امیر: اس ضمن میں پہلی اصطلاح ہے امیر۔ امیر سے کیا مراد ہے؟ آپ کے علم میں ہے کہ لفظ امیر سے ملتا جلتا ایک اور لفظ اردو میں مستعمل ہے، یعنی آمر۔ آمر کا لفظ انگریزی Dictator کے مترادف کے طور پر بولا جاتا ہے اور یہ لفظ کبھی بھی اچھے معنوں میں نہیں آتا۔ اگر آپ کسی قائد یا رہنما کو "آمر" کہہ دیں یا اس کے رویّے کو "آمرانہ" قرار دیں تو گویا یہ ایک شدید تنقید سمجھی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آج ایک ایسے دَور میں سانس لے رہے ہیں جو جمہوریت اور عوام کی حاکمیت کا دور ہے، اور اس ماحول میں کوئی بھی ایسی شے پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی جو سلطانیٔ جمہور کے اونچے تصورات سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ لیکن نوٹ کیجئے کہ امیر کا لفظ آمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ گاڑھا ہے۔

عربی زبان کی باریکیوں سے واقفیت رکھنے والے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیں گے کہ جب کوئی شخص ایک کام کر رہا ہو تو اسے "فاعل" کہتے ہیں، مثلاً قادر، عالم، آمر وغیرہ، لیکن جب اس کام کو کرنے کی صلاحیت اور صفت اس شخص میں مستقل طور پر پائی جائے اور اس کی شخصیت کا مستقل جزو بن جائے تو پھر اسے "فعیل" کہتے ہیں، مثلاً قدیر، علیم، اور امیر۔ چنانچہ دوبارہ نوٹ کیجئے کہ جس حدیث کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں اس میں قائد یا رہنما کے لئے لفظ امیر استعمال ہوا ہے جو آمر سے کہیں زیادہ گاڑھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "جس نے میری اطاعت کی اس نے اصل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے (میرے مقرر کئے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے (میرے مقرر کئے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی"۔ (متفق علیہ: عن ابی ہریرہؓ)

ظاہر ہے کہ جب حضور ﷺ اس دنیا میں بنفسِ نفیس موجود تھے تو آپؐ خود ہی مسلمانوں کے امیر بھی تھے، فوج کے سپہ سالار بھی تھے، اور سربراہِ حکومت بھی تھے۔ لیکن اُس وقت بھی آپؐ کے مقرر کردہ امراء کا ایک پورا سلسلہ موجود تھا اور یہ امراء مختلف سطحوں پر نگران اور قائد تھے۔ مثال کے طور پر اگر کسی غزوے کا موقع ہو تو ظاہر ہے کہ فوج کے سپہ سالار تو حضور ﷺ خود ہی تھے، لیکن پھر آپؐ کے تحت دوسرے امراء بھی مقرر ہوتے تھے، مثلاً میمنہ کا امیر، میسرہ کا امیر، وغیرہ۔ پھر ان بڑی شاخوں کے آگے چھوٹی شاخیں اور ان میں سے ہر ایک کے لئے الگ امیر کا تقرر ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد امراء کی ایک پوری زنجیر تھی اور اس زنجیر کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔ اگر اس سلسلے میں کہیں کوئی خرابی ہوتی تو لازماً منفی نتائج برآمد ہوتے۔ چنانچہ یہی چیز غزوۂ احد میں پیش آئی۔

غزوۂ احد میں حضور ﷺ نے ۵۰ تیراندازوں کا ایک دستہ ایک پہاڑی درّے پر مقرر فرمایا اور حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو اس کا امیر بنایا۔ آپؐ کا حکم تھا کہ تم یہاں سے ہرگز مت ہلنا، یہاں تک کہ اگر تم دیکھو کہ تمام مسلمان مارے گئے ہیں تب بھی تم اپنی جگہ مت چھوڑنا۔ جنگ کے دوران جب تیراندازوں نے دیکھا کہ دشمن مغلوب ہو گیا ہے تو انہوں نے اپنے امیر یعنی حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے روکنے کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میری رائے یہ ہے کہ تیراندازوں نے حضورؐ کے حکم کی تاویل کی، اور یہ سمجھا کہ حضورؐ کا حکم صرف اس صورت میں تھا اگر مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوتا، لیکن یہاں تو ہمیں فتح مل رہی ہے۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان صحابہؓ نے حضورؐ کی نہیں بلکہ اپنے مقامی امیر کی حکم عدولی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کے گھڑسواروں نے موقع غنیمت جان کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور شدید نقصان پہنچایا۔ ۳۵ صحابہؓ کی غلطی کی وجہ سے ۷۰ صحابہ شہید ہوئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمان افواج پر واضح کر دیا کہ نظم کی کیا اہمیت ہے اور امیر کا حکم نہ ماننے کی کس طرح سزا ملتی ہے۔

غور کیجئے کہ اسلام نظم اور تنظیم کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپ کو براہ راست خود رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا تھا۔ بعد میں

صورت حال یہ رہی کہ مسلمان خود اپنے خلیفہ یا امیر کو باہمی مشورے کے ذریعے منتخب کرتے تھے۔ لیکن ایک حدیث کے مطابق' جس کے راوی حضرت عرباض بن ساریہؓ ہیں' حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ (اے مسلمانو!) تم پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ کوئی شخص تمہارا امیر بن بیٹھے[1] (یعنی مسلمانوں کی مرضی کے بغیر) بشرطیکہ وہ تمہیں کوئی خلافِ شریعت حکم نہ دے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں اجتماعیت اور نظم کی کیا اہمیت ہے کہ اگر کوئی شخص زبردستی حکومت پر قبضہ کرلیتا ہے تب بھی شریعت کے دائرے کے اندر اس کی اطاعت کی جائے گی۔ مقصد یہ ہے کہ غیر ضروری فتنہ و فساد سے امت کو بچایا جائے۔ امیر کے حکم کی نافرمانی صرف اسی صورت میں جائز ہے اگر وہ واضح طور پر شریعت سے تجاوز کرے' اور مسلح بغاوت اسی صورت میں صحیح ہوگی اگر ایک پائیدار تبدیلی برپا کردینے کے لئے کافی طاقت فراہم ہو چکی ہو۔

خود سے امیر بن جانے کی ایک صورت اور بھی ممکن ہے' مثلاً میں بھی امیر ہوں' حالانکہ کسی نے مجھے منتخب نہیں کیا ہے۔ میں پاکستان میں ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی' یا دوسرے لفظوں میں نظامِ خلافت' قائم کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ مجھے ساتھی اور اعوان و انصار درکار ہیں۔ میں

---

[1] حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی یہ روایت امام نوویؒ نے اپنی "اربعین" میں ترمذی اور ابوداؤد کے حوالے سے درج کی ہے' جس کے الفاظ ہیں: "اُوصِیکم بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَۃِ وَاِنْ تَأمَّرَ علیکم عَبْدٌ... الخ" (حدیث ۲۸) یعنی "میں تمہیں خدا ترسی کی نصیحت کرتا ہوں اور سننے اور ماننے کی' خواہ تم پر ایک غلام ہی امیر بن بیٹھے"۔ لیکن ترمذی اور ابوداؤد کے علاوہ سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں بھی عرباض بن ساریہ کی روایت جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے ان میں "تَأمَّرَ علیکم" کے الفاظ شامل نہیں ہیں ---- تاہم امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث مبارک "وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَیکم عَبدٌ یقودُکم بکتابِ اللّٰہ فَاسْمَعُوا لَہٗ وَاَطِیعُوا" کے ذیل میں لکھا ہے کہ "ایک غلام اگر غلبہ حاصل کرکے از خود امیر بن بیٹھے اور امورِ سلطنت کتاب و سنت کے مطابق انجام دے تو اس کی اطاعت لازم ہے۔ البتہ عام حالات میں جبکہ امیر کا انتخاب مسلمانوں کی آزادانہ رائے سے ہو رہا ہو' کسی غلام کو امیر منتخب کرنا درست نہیں ہوگا"۔ (حاشیہ از ادارۂ میثاق)

عوام میں اپنے خیالات کو عام کرتا ہوں اور پھر یہ پکار لگاتا ہوں کہ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟ کون لوگ اس کام میں میرے دست و بازو بننے کو تیار ہیں؟ کون لوگ اللہ کی حاکمیت کو بالفعل قائم کرنے کے کام میں میری مدد کریں گے؟ اب جو افراد بھی مجھ سے اتفاق کرتے ہیں اور میرے بتائے ہوئے طریق کار کو درست سمجھتے ہیں وہ میرے ساتھ مل جاتے ہیں' میرے ساتھی اور اعوان و انصار بن جاتے ہیں۔ اس طرح کی جماعت اوپر سے نیچے کی طرف بڑھتی ہے۔ چونکہ لوگ میری پکار پر جمع ہوئے ہیں لہٰذا میں خود بخود امیر بن جاتا ہوں' اور کسی قسم کے انتخاب کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اب آپ ان چار اقسام کے امراء کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اولاً وہ امیر جسے کوئی بڑا امیر کسی خاص علاقے یا کسی مخصوص گروہ کا قائد مقرر کرے۔ مثلاً وہ امراء جنہیں رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا تھا۔ ثانیاً وہ امیر جسے مسلمان باہمی مشورے اور رضامندی سے اپنا حاکم منتخب کریں۔ مثلاً خلفائے راشدینؓ۔ ثالثاً وہ شخص جو مسلمانوں کی مرضی کے بغیر حکومت پر قبضہ کر کے ان کا حاکم بن جائے۔ مثلاً مسلمانوں کی تاریخ کے اکثر بادشاہ اور آج کے دور کے فوجی حکمران۔ رابعاً وہ شخص جو اسلام کے لئے کسی جدّوجہد کا آغاز کرنا چاہے اور اس میں اسے دوسرے مسلمانوں کی مدد اور ان کے تعاون کی ضرورت ہو۔ یہ شخص ابتداء میں داعی کے طور پر کام کرتا ہے اور لوگوں کو جمع کرنے کے لئے پکار لگاتا ہے۔ جب لوگ جمع ہو کر اس کے ساتھی بن جاتے ہیں تو وہ ان کا فطری امیر بن جاتا ہے۔

۲۔ سمع و طاعت : امیر کے بعد دوسری اصطلاح جس کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے وہ ہے "سمع و طاعت"۔ واضح رہے کہ جس طرح "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بظاہر دو کام ہیں لیکن اصلاً ایک ہی اصطلاح بنتے ہیں' اسی طرح سمع و طاعت بھی قرآن حکیم کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے دونوں اجزاء باہم پیوست ہیں اور جدا نہیں کئے جا سکتے۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ سمع و طاعت دراصل فوج کے نظم کو ظاہر کرنے کی خاص اصطلاح بھی ہے۔ ایک عام سپاہی کا فرض یہ ہے کہ وہ سنے اور اطاعت کرے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنے سے بالاتر افسر سے احکامات وصول کرے اور ان پر عمل پیرا ہو۔ اسے اس کا

حق نہیں ہے کہ وہ اپنے کمانڈر سے بحث کرے اور اس کے حکم کی علت یا مقصد دریافت کرے۔ ظاہر ہے کہ ایک جنگ کے دوران وہی سپاہی کار آمد ثابت ہوں گے جو کیا اور کیوں کی بحث میں پڑنے کے بجائے اپنے افسر کے احکامات کو سنیں اور عمل کریں۔ فوج کا یہی وہ نظم ہے جسے ایک مشہور انگریزی نظم Charge of the Light Brigade میں بیان کیا گیا ہے۔ کسی لڑائی کے دوران صورت حال یہ ہوئی کہ فوج کے ایک دستے کو آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ لیکن دشمن کی توپیں ہر طرف موجود تھیں۔ ہر سپاہی سمجھ رہا تھا کہ آگے بڑھنے کا حکم صریحاً کسی غلطی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود کسی نے بحث نہیں کی' کسی نے وضاحت طلب نہیں کی' اور کسی نے حکم کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال نہیں اٹھایا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی اور سب کے سب مارے گئے۔

Their's not to reason why,
Their's but to do and die.

اس موقع پر میں قرآن مجید کے تین مقامات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں' تاکہ سمع و طاعت کی جو اہمیت اسلام کے نظام زندگی میں ہے وہ پوری طرح واضح ہو جائے۔

﴿ ... وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (البقرہ : ۲۸۵)

"... اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا' ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

﴿ وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ' وَاتَّقُوا اللّٰهَ ' اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ ﴾ (المائدہ : ۷)

"اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر اور عہد اس کا جو تم سے ٹھہرایا تھا جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' بیشک اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات"۔

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ... ﴾ (التغابن : ۱۶)

"سو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں تک ہو سکے اور سنو اور مانو' اور خرچ کرو اپنے بھلے کو..."

اسلام میں نظمِ جماعت کی اساس

جیسا کہ میں نے عرض کیا' جماعت سازی کا جو طریقہ ہمیں قرآن میں ملتا ہے' حضور ﷺ کی سُنّت میں نظر آتا ہے' اور امّتِ مسلمہ کی ۱۳سو سالہ تاریخ میں جس کی مثالیں ملتی ہیں وہ صرف ایک ہے۔ یہ طریقہ بیعت کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیعت سے کیا مراد ہے؟

عربی میں بَاعَ یَبِیْعُ کے معنی ہیں بیچنا۔ اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بیچنے کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی اصل "تبادلہ" ہے۔ مثلاً آپ روپے دے کر آٹا حاصل کر لیتے ہیں۔ اور کرنسی کی ایجاد سے پہلے ایک جنس کے تبادلے میں دوسری جنس حاصل کی جاتی تھی۔ یہاں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ آپ روپے کو قیمت سمجھیں اور آٹے کو جنس یا آٹے کو قیمت قرار دیں اور روپے کو جنس کہہ لیں۔ وجہ یہ ہے کہ جہاں بھی بیچنے کا عمل ہو گا وہاں خریدنے کا عمل بھی لامحالہ ہو گا۔

اس تفصیل سے میرا مقصد یہ ہے کہ آپ سورۂ توبہ کی اس آیت کے اصل مفہوم کو اور اس آیت کی شان اور عظمت کو سمجھ سکیں :

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ؕ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝﴾ (التوبہ : ۱۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے خریدلی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔ وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ وعدہ ہو چکا اللہ کے ذمہ پر سچا توریت اور انجیل

اور قرآن میں، اور کون ہے جو اپنے وعدے کا پورا کرنے والا ہو اللہ سے بڑھ کر؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اس سے کیا ہے، اور یہی ہے بڑی کامیابی"۔

یہ آیت قرآن مجید کی اہم ترین آیات میں سے ایک ہے، بدقسمتی سے آج ہماری زندگیوں میں اس آیت کی وہ اہمیت نہیں رہی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں اس کو حاصل تھی۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ مومن اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس سودے میں اللہ تعالیٰ خریدار ہے اور مومن فروخت کرنے والا ہے۔ ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو، اپنی صلاحیتوں اور اوقات کو، اپنے وسائل اور اموال کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں کھپا دینے کے لئے آمادہ ہے، اور ان تمام قربانیوں کے عوض اس سے موت کے بعد کی زندگی میں جنت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ وہ سودا ہے جو مومن اور اللہ تعالیٰ کے مابین انجام پاتا ہے۔ اس سودے کے نتیجے میں اہل ایمان اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔ اس جنگ میں وہ اللہ کے دشمنوں کو بھی قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل ہوتے ہیں۔

یہ سودا جو ایک مومن اور اللہ تعالیٰ کے مابین ہوتا ہے نقد کا نہیں بلکہ ادھار کا معاملہ ہے۔ مومن سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسے اللہ کی راہ میں صرف کردے۔ اور جواباً اسے ملتا کیا ہے؟ محض ایک وعدہ۔ اللہ کی طرف سے یہ وعدہ کہ اسے اس کی محنت اور قربانی کا صلہ آخرت میں ملے گا۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ اعتراض کرسکتا ہے اس معاملے میں کافی خطرہ (risk) نظر آتا ہے۔ اگر میں اپنا سب کچھ یہاں اللہ کی راہ میں قربان کردوں اور موت کے بعد مجھے اس کا صلہ نہ ملے تب تو یہ گھاٹے کا سودا ہوا۔ اس طرح تو میں دنیا میں بھی نقصان میں رہا اور آخرت میں بھی۔

ظاہر ہے کہ ادھار کے سودے میں شکوک و شبہات کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہایت شدّومدّ کے ساتھ فرمایا ہے کہ اس وعدے کا پورا کرنا اس

نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ لہٰذا کسی کو اس معاملے میں ہرگز متزلزل نہ ہونا چاہئے۔ یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے اور وہ لازماً اسے پورا کرے گا۔ اس نے یہ وعدہ تین مرتبہ کیا ہے' تورات میں' انجیل میں' اور پھر قرآن مجید میں۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے قول کا سچا اور وعدے کا پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اس سودے پر جو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے خوشیاں مناؤ۔ تم سے جو کچھ قربان کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ نہایت حقیر شے ہے' اور جس کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ابدی راحت ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے جو کسی انسان کو حاصل ہو سکتی ہے۔

سورۂ توبہ کی یہ آیت لفظ اِشْتَرٰی سے شروع ہو کر بَیْعِکُمْ پر ختم ہوتی ہے۔ ان دونوں الفاظ میں کیا فرق ہے؟ اِشْتَرٰی کا مطلب ہے خریدنا' اور بیع سے مراد وہ تبادلہ ہے جو دو اشخاص کے مابین ہوتا ہے اور جسے ہم "خرید و فروخت" کہتے ہیں۔ عربوں کا عام رواج تھا کہ جب ان کے درمیان خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا تو وہ پہلے تو قیمت اور جنس کی خوبیوں یا خامیوں کے متعلق بحث کرتے' اور جب معاملہ طے پا جاتا تو وہ ہاتھ ملا کر یہ ظاہر کرتے کہ اب کوئی فریق سودے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ یہ آخری معاہدہ' جس کی علامت کے طور پر ہاتھ ملائے جاتے تھے' مبایعت کہلاتا ہے' اور یہی وہ چیز ہے جو بیعت کی بنیاد بنی۔

قرآن و سُنّت میں بیعت کا ثبوت

یہاں اہم بات یہ ہے کہ یہ سودا اصل میں تو اللہ تعالیٰ اور مومن کے درمیان ہوتا ہے' لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ بذاتہٖ اور براہِ راست یہ سودا نہیں کرتا' لہٰذا ہمیں ایک درمیانی فریق کی ضرورت پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کی جان و مال کا خریدار ہے' اور مومن اس سودے کے لئے تیار ہے' لیکن یہ سودا کس طرح انجام پائے گا؟ مومن کو کون بتائے گا کہ اسے کب اور کس طرح اپنی جان اور اپنے مال کو پیش کرنا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ مکی زندگی کے بارہ برسوں میں حکم یہ تھا کہ کوئی مزاحمت یا جوابی کارروائی نہیں کرنا ہے۔ پھر مدینے میں جا کر حکم ملا کہ اب تصادم اور جنگ کا مرحلہ آ گیا ہے۔ لیکن یہ تمام احکام کس نے

دیئے؟ اس موقع پر تنظیم اور امیر اور سمع وطاعت کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

یہ سارا معاملہ فی الواقع بہت منطقی اور سادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ خریدار ہے' مومن اپنے جان و مال کو جنت کے عوض فروخت کر رہا ہے' اور ان دونوں کے درمیان رسول اللہ ﷺ تھے۔ اصل خریدار تو اللہ تعالیٰ ہے' لیکن اطاعت کا وعدہ حضور ﷺ سے کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے :

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ' یَدُاللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ' فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ' وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ (الفتح : ۱۰)

"(اے نبیؐ) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہو گا' اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ عنقریب اسے بڑا اجر عطا فرمائے گا"۔

معلوم ہوا کہ یہ اصل میں ایک سہ فریقی معاہدہ ہے' جان و مال کا سودا تو اللہ تعالیٰ اور مومن کے درمیان طے پایا' لیکن اطاعت کا وعدہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے ہوا۔ مطلب یہ کہ گویا مومن رسولؐ سے عرض کرتا ہے کہ میری زندگی اور میرا مال آپؐ کی خدمت میں پیش ہیں' جس طرح آپ حکم دیں گے ویسے ہی ان چیزوں کو قربان کر دوں گا۔ اس میں آخری مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور اخروی کامیابی ہے۔

وہ بیعت جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمان مَردوں سے لی تھی' اس کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے' اگرچہ احادیث میں اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم وہ بیعت جو حضور ﷺ نے خواتین سے لی تھی' اس کا ذکر واضح الفاظ میں قرآن حکیم میں موجود ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَاَرْجُلِھِنَّ

وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (الممتحنہ : ۱۲)

"اے نبیؐ، جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لئے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اور اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی، اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا رحم کرنے والا ہے"۔

سیرتِ نبویؐ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جو سب سے اہم بیعت ہوئی ہے وہ "بیعتِ رضوان" ہے، جو حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ سے متصلاً قبل صحابہؓ سے لی تھی۔ تاہم ہجرت سے پہلے کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو نہایت اہم مواقع پر بیعت ہوئی ہے۔ یعنی جب یثرب سے آنے والوں نے حضور ﷺ سے قول و قرار کیا۔

منیٰ کا جو مقام مکے سے قریب ترین ہے وہ وادیٔ عقبہ ہے، جہاں حج کے موقع پر یثرب کے چھ افراد نے حضور ﷺ سے ملاقات پر اسلام قبول کیا۔ اگلے برس ان میں سے پانچ افراد دوبارہ حج پر آئے اور ۷ مزید افراد کو ہمراہ لائے۔ اس موقع پر ان ۱۲ افراد نے حضور ﷺ سے وہ قول و قرار کیا جسے بیعتِ عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے۔ اس بیعت کے الفاظ وہی تھے جو بیعت النساء کے حوالے سے سورۃ الممتحنہ میں وارد ہوئے ہیں۔ اس سے اگلے برس ۷۲ مرد اور دو خواتین یثرب سے آئے اور انہوں نے حضور ﷺ سے وہ عہد کیا جسے بیعتِ عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ اس دوسری بیعت کے الفاظ نہایت اہم ہیں، جنہیں ہم ابھی بیان کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے مختلف اوقات میں کئی قسم کے عہد لئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی کسی مضبوط وعدے کی ضرورت پیش آئی تو حضور ﷺ نے ہمیشہ بیعت ہی کا معاملہ فرمایا۔ چنانچہ علم حدیث کے ایک عظیم عالم امام نسائیؒ نے دس مختلف اقسام کی بیعتوں کا ذکر کیا ہے جو حضور ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے لی تھیں۔ (۱) سمع و

طاعت کی بیعت (۲) ہمیشہ سچ بولنے پر بیعت (۳) اس بات پر بیعت کہ حضورؐ کو صحابہ میں سے کسی کو بھی ترجیح دینے کا اختیار ہوگا (۴) اس بات کا عہد کہ ہم میدان جنگ سے نہ بھاگیں گے (۵) اس بات کا وعدہ کہ ہم جہاد کریں گے (۶) اس بات پر بیعت کہ ہمیشہ عدل پر مبنی بات کہیں گے (۷) ہر مسلمان کی خیر خواہی کی بیعت (۸) اللہ کے راستے میں جان قربان کرنے پر بیعت (۹) اس بات کا عہد کہ ہم حضورؐ کے حکم پر اپنے گھروں کو چھوڑ دیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ لینے اور نظم قائم کرنے کا واحد طریقہ جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور سُنّت سے ملتا ہے وہ بیعت پر مبنی ہے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ رضی اللہ عنہم خندق کھود رہے تھے تو ان کی زبانوں پر یہ شعر جاری تھا ؎

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

(بخاری، مسلم، مسند احمد)

اسلامی تاریخ میں بیعت کا مقام

میں عرض کر چکا ہوں کہ امّتِ مسلمہ کی ۱۳ سو سالہ تاریخ میں جماعت سازی کے لئے صرف بیعت ہی کی اساس ملتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد جو نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوا اس کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ پھر جب صحابہؓ نے محسوس کیا کہ خلافت کا ادارہ رفتہ رفتہ ملوکیت میں تبدیل ہو رہا ہے اور انہوں نے اس زوال کو روکنے کے لئے جدوجہد کی تو اس میں بھی بیعت کا طریقہ ہی اختیار کیا گیا۔ چنانچہ حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دونوں کی جدوجہد بیعت کی اساس پر ہوئی۔ اس کے بعد جب ملوکیت نے اپنے پنجے پوری طرح گاڑ لئے تب بھی خلفاء (اصل میں ملوک) اپنی حکومت کو بیعت کی بنیاد پر استوار کرتے رہے۔

اصولی طور تو اسلام میں مذہب و سیاست کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے، لیکن عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ عہد ملوکیت میں یہ تقسیم نمایاں ہونے لگی تھی۔ نتیجتاً بیعت کا ادارہ بھی دو

حصوں میں منقسم ہو گیا۔ بادشاہ عوام سے سیاسی اطاعت کا وعدہ بیعت کے ذریعے لیتے تھے' لیکن ساتھ ہی اسلامی معاشرے میں افراد کے تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کے لئے صوفیائے کرام بھی لوگوں سے روحانی اور اخلاقی اطاعت کا وعدہ لینے لگے' اور یہ شے بیعتِ ارشاد کہلائی۔

بیعتِ ارشاد سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص محسوس کرتا ہے کہ اسے کسی بزرگ رہنما کی ضرورت ہے جو اسے ایک بہتر مسلمان بننے میں مدد دے۔ اس مقصد کے تحت وہ کسی ایسے متقی شخص کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنا چاہتا ہے جو خود اپنے نفس کا تزکیہ کر چکا ہو اور دوسروں کی اس راہ میں رہنمائی کر سکتا ہو۔ یہ وابستگی بیعت کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی مرید یا سالک کسی بزرگ سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ آپ مجھ سے علم' تجربے اور تقویٰ میں بہت آگے ہیں' لہٰذا آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے' میں اس معاملے میں آپ کی اطاعت کروں گا اور آپ میرے اخلاق اور میری روحانی ترقی کی نگرانی فرمائیں گے۔ یہ وہ شے ہے جسے بیعتِ ارشاد کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے طویل انحطاط اور زوال کے نتیجے میں آج صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ جب بیعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو عموماً ایک عام مسلمان کے سامنے بیعتِ ارشاد ہی کا تصور آتا ہے۔ یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ بیعتِ ارشاد کے لئے قرآن مجید میں جواز بیعت النساء کی صورت میں موجود ہے' جس کا مقصد بھی یہی تھا جو بیعت ارشاد کا ہوتا ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ صدی میں مسلمانوں کو غیر ملکی استعمار سے نجات دلانے کے لئے جتنی بھی عسکری تحریکیں چلیں' ان سب کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں سید احمد بریلوی کی تحریکِ شہیدین' لیبیا میں محمد بن علی السنوسی کی سنوسی تحریک' اور سوڈان میں محمد احمد المہدی کی تحریک' سب میں نظم کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ موجودہ صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جب ۱۹۱۳ء اپنی جماعت یعنی حزب اللہ قائم کی' تو بیعت ہی کو اس کی اساس کے طور پر اختیار کیا۔ اسی طرح الاخوان المسلمون کے بانی ارکان نے شیخ حسن البنّاء شہید کے ہاتھ پر بیعت کی تھی' جو مرشدِ عام کہلاتے تھے۔ اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے موجودہ صدی کا ایک نہایت اہم واقعہ بیان

کروں جو اکثریت کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ جمعیت علمائے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے کی' اور علماء سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ سب مل کر ابوالکلام آزاد کو اپنا متفقہ قائد تسلیم کرلیں' ان سے بیعت کریں' اور ہندوستان میں آزادی اور اسلامی حکومت کے قیام کے لئے منظم جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس تجویز کو علماء میں پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔

موجودہ صدی کی ایک اور تحریک جو بیعت کی بنیاد پر منظم ہوئی تھی وہ قادیانیت کے فتنے کا مقابلہ کرنے کے لئے تھی۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ۵۰۰ علماء اکٹھے ہوئے' جن میں سے اکثریت کا تعلق دیوبندی مکتب فکر سے تھا' اور انہوں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت مان کر ان سے بیعت کی۔ اگرچہ مولانا بہت نمایاں مذہبی عالم نہ تھے' اس کے باوجود ان سے بیعت کرنے والوں میں مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا انور شاہ کاشمیری جیسے جید علماء بھی شامل تھے۔

غرضیکہ امت کی ۱۳ سو سالہ تاریخ کی گواہی ہمارے سامنے موجود ہے کہ جہاں بھی کسی منظم جدوجہد کے لئے جماعت سازی کی ضرورت پیش آئی وہاں ہمیشہ بیعت ہی کے طریقے کو اختیار کیا گیا۔ خواہ معاملہ حکومت بنانے کا ہو' یا اسلامی اصولوں کو نظامِ حکومت میں دوبارہ رائج کرنے کا ہو' تزکیۂ نفوس اور اصلاحِ باطن کا مسئلہ ہو' یا مسلمانوں کے علاقوں کو غیر مسلموں سے آزاد کرانے کی جدّوجہد ہو' ہر بار افراد کو جمع کرنے اور منظم کرنے کے لئے صرف بیعت کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس میں واحد استثناء مولانا مودودی کی جماعت اسلامی کا ہے جو بیعت کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے امت کی تاریخ کے ۱۳ سو برسوں کا حوالہ دیا ہے' کیونکہ چودھویں صدی میں ایک بڑی تحریک کا دستوری بنیاد کو اختیار کرنے کا معاملہ بھی موجود ہے۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت کی بیعت

جہاں تک میرا تعلق ہے' تو میں نے تنظیم اسلامی بیعت کی بنیاد پر قائم کی ہے۔ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے جو بیعت ہے اس کے الفاظ ایک مستند حدیث سے لئے گئے

ہیں۔ یعنی بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر یثرب سے آنے والوں نے حضور ﷺ سے جن الفاظ میں بیعت کی' انہی الفاظ کو ایک تبدیلی کے ساتھ ہم نے اختیار کیا ہے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اس حدیث کے الفاظ میں ایک حزب اللہ قائم کرنے کے لئے پورا منہج اور طریقہ کار موجود ہے' یعنی ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کو قائم کرنے کا پورا نقشہ اس حدیث سے مستنبط کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کوئی جماعت بنا رہے ہیں تا کہ سماجی سطح پر فلاح و بہبود کا کام کیا جاسکے تو کسی بھی قسم کا دستوری ڈھانچہ اختیار کیا جاسکتا ہے' لیکن جہاں معاملہ ہو ایک انقلابی جماعت کے قیام کا' جسے غیر معمولی نظم اور اندرونی ہم آہنگی درکار ہوتی ہے' تو یہ جماعت صرف بیعت کی بنیاد پر قائم ہونی چاہئے۔

پیش نظر حدیث حضرت عبادۃ بن الصامتؓ سے روایت کی گئی ہے' اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے اسے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ بیعت کے الفاظ ایسے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان کے ذریعے تنازعات کے تمام دروازے بند فرما دیئے ہیں۔ عبادہ بن الصامتؓ فرماتے ہیں :

((بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ' فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ' وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا' وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ' وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا' لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ)) (متفق علیہ)

"ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے' خواہ آسانی ہو یا مشکل' خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو یا ہمیں اس پر جبر کرنا پڑے' اور خواہ دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دے دی جائے۔ ہم اصحاب اختیار سے جھگڑیں گے نہیں' لیکن سچ بولیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے' اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے پروا رہیں گے۔

غور کیجئے کہ جہاں بھی کوئی اجتماعی جدّوجہد ہو رہی ہو اور کسی خاص مسئلے پر فیصلہ کرنا پڑے تو بے شمار آراء سامنے آتی ہیں' اور بہت سے مختلف بلکہ متضاد حل پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن قائد کو صرف ایک ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر جن ارکان

کی رائے کے مطابق فیصلہ ہو جائے وہ اس پر عمل کرنے میں انشراح اور آمادگی محسوس کریں گے' اور جن کی مرضی یا رائے کے خلاف فیصلہ ہو جائے وہ عمل در آمد کے معاملے میں انقباض محسوس کریں گے۔ حضور ﷺ نے تنازعات اور نظم کی خلاف ورزی کے اس امکان کو اس طرح ختم کیا کہ صحابہؓ سے یہ عہد لے لیا کہ وہ ہر حال میں اطاعت کریں گے' خواہ جو حکم انہیں ملا ہو وہ اس سے سو فیصد متفق ہوں یا نہ ہوں' خواہ حکم پر عمل کرنے میں وہ دل کی آمادگی پائیں یا انہیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے۔

اسی طرح اصحابِ اختیار کو مقرر کرنے کا معاملہ بھی ایسا ہے جہاں بہت سے اختلافات ابھر سکتے ہیں۔ اگر کسی باصلاحیت مگر نووارد رُکن کو کسی اہم عہدے پر فائز کر دیا جائے تو پرانے اراکین میں ناراضگی پیدا ہو سکتی ہے۔ تنازع کے اس دروازے کو بند کرنے کے لئے حضور ﷺ نے صحابہؓ سے یہ عہد لیا کہ مختلف عہدے یا ذمہ داری کے مناصب دینے کے معاملے میں کُل اختیار میرا ہو گا' اور یہ کہ وہ لازماً سمع و طاعت کی روش پر قائم رہیں گے خواہ وہ یہ محسوس کریں کہ دوسروں کو ان پر ترجیح دی جا رہی ہے۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ "سمع و طاعت" کی اصطلاح سے غیر معمولی نظم کا جو نقشہ ذہنوں میں ابھرتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک اسلامی انقلابی جماعت کے ارکان بلا سوچے سمجھے اور اپنے ذہن اور عقل و فہم کی صلاحیتوں کو بالائے طاق رکھ کر امیر کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ ان کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے ہوں اس کا برملا اظہار کریں' اور امراء کے طرزِ عمل یا حکمت عملی میں کوئی غلط شے دیکھیں تو اپنی زبانوں پر تالے ڈال کر نہ بیٹھے رہیں۔ چنانچہ بیعت کے الفاظ میں ہے کہ "اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا" (ہم سچ کہیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے)۔ ظاہر ہے کہ بیعت کی بنیاد پر تنظیم بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آخری فیصلے کا اختیار ایک فرد کے پاس ہو گا' یعنی تمام بحث و تمحیص اور گفتگو اور مشاورت ہو جانے کے بعد جب فیصلے کا وقت آئے گا تو یہ فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہیں بلکہ امیر کی مرضی سے ہو گا۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے بیعت کے جو الفاظ اختیار کئے گئے ہیں اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں ایک شخص شعوری طور پر یہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی

معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ پھر وہ اللہ سے اپنے تمام سابقہ گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور مستقبل میں گناہوں سے اجتناب کا پختہ وعدہ کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں وہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ ہر اس شے کو چھوڑ دے گا جو اللہ کو ناپسند ہے' اور یہ کہ وہ اس کے راستے میں مقدور بھر جدوجہد کرے گا' اپنے مال سے بھی اور جان سے بھی' تاکہ اس کے دین کو قائم کیا جا سکے۔ تیسرے حصے میں وہ تنظیم اسلامی کے امیر کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ ان کے تمام احکام کو سنے گا اور ان پر عمل کرے گا' بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ یہ آخری شق' یعنی اطاعت "فی المعروف" ہو گی نہ کہ مطلق' وہ اضافہ ہے جو ہم نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے الفاظ میں کیا ہے۔

بیعت کی تاکیدی اہمیت

حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً))

(صحیح مسلم' کتاب الامارہ' عن عبداللہ بن عمر)

"جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا"۔

یعنی ایسا شخص حقیقی معنوں میں ایک مسلمان کی موت نہیں مرا۔ یہ حدیث بالکل واضح ہے' لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہے کہ اگر ہم کسی متقی شخص کے ساتھ اپنے آپ کو بیعتِ ارشاد کے ذریعے وابستہ کر لیں تو اس حدیث پر عمل ہو جائے گا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے! مذکورہ حدیث میں بیعت سے مراد وہ بیعت ہے جو امت کی مجموعی ہیئت سے تعلق رکھتی ہے' اور اس کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کم از کم شرائط پوری کرنے والی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت قائم ہو تو خلیفۃ المسلمین یا امیرالمومنین کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی' اگر ایسا نہیں ہے تو مسلمانوں پر ایسی ریاست اور ایسا نظام بالفعل قائم کرنے کے لئے کوشش فرض ہو جاتی ہے' اور اس جدّوجہد کے لئے جو حزب اللہ قائم ہو گی اس کے امیر سے بیعت کی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ نظام خلافت آسانی سے قائم ہو جانے والی شے تو نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے ہمیں جدوجہد کرنا پڑے گی اور بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑیں گی۔ اپنا وقت، صلاحیتیں، اور وسائل کھپانے پڑیں گے۔ دنیا میں کوئی بھی بڑا کام اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر اسلامی ریاست قائم نہیں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے قائم کرنے کے لئے کوشش کریں، اور یہ کوشش ایک مضبوط اور منظم جماعت ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے نہ کہ انفرادی طور پر۔ اور ایک مضبوط اور منظم جماعت صرف بیعت ہی کے اصول کو اختیار کر کے وجود میں لائی جا سکتی ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک ہی ایسی صورت ہے جس میں ایک مسلمان کو بیعت کے بغیر زندگی گزارنے کی اجازت ہے۔ یعنی فتنے اور فساد کی وہ کیفیت جس میں کسی کو کسی کا ہوش نہ ہو، کسی کو معلوم نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے، ایسے میں کس کا ساتھ دینا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے۔ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ فتنہ و فساد کے عہد میں رہ رہے ہیں، اور اس لئے بیعت سے مستثنیٰ ہیں، تو جان لیجئے کہ ایسی حالت میں آپ کے لئے جائز نہیں کہ کسی مہذب معاشرے میں رہیں، بلکہ ضروری ہے کہ آپ ہر شے کو چھوڑ کر کسی جنگل میں جا بسیں۔ لیکن اگر آپ ایک نارمل زندگی گزار رہے ہیں، شہری زندگی اور ٹیکنالوجی کے تمام فوائد اور سہولتوں سے مستفید ہو رہے ہیں اور پھر بھی آپ کا خیال ہے کہ فتنہ و فساد کی وجہ سے آپ کو بیعت سے استثناء مل گیا ہے تو یہ خیال محض خود فریبی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت دے کہ ہم حق کو اختیار کریں خواہ وہ کسی جگہ سے ملے، اور ہمیں توفیق دے کہ ہم مسلمان جئیں اور مسلمان مریں۔ اور توفیق دے کہ ہم وہ کام کریں جو اسے پسند ہوں۔ آمین OO

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

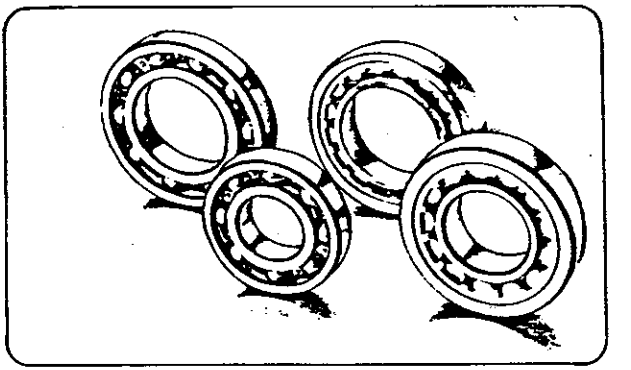

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE :
(Opening Shortly)
Amin Arcade 42,
Brandreth Road, Lahore-54000
Ph : 54169

GUJRANWALA :
1-Haider Shopping Centre, Circular Road,
Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

کفر و گمراہی اور صراطِ مستقیم

کفرِ اعتقادی اور کفرِ عملی میں فرق کرنا ضروری ہے!

علامہ محمد ناصر الدین الالبانی سے ایک استفسار اور اس کا مفصّل جواب

علامہ ناصر الدین الالبانی کی شخصیت علمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ علم حدیث کے میدان میں ان کی خدمات اور مقام و مرتبے کو پوری مسلم دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ذیل کا مضمون اگرچہ ایک مخصوص سوال کے مفصل جواب پر مشتمل ہے تاہم ضمنی طور پر بعض نہایت قیمتی اصولی مضامین بھی اس میں زیر بحث آئے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون ان لوگوں کے لئے درس فکر ہے جو قرآن و سنت کی علمی و عملی تعبیر کے ضمن میں سنّتِ خلفائے راشدین، تعامل صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور خیر القرون کے اکابر کی تشریحات سے بے نیاز ہو کر محض اپنے علم و فہم پر اعتماد کی روش اختیار کئے ہوئے ہیں اور اسلام کے چودہ سو سال سے متفقہ احکام کو مشکوک بنانے کی خاطر ان کو صحافتی و عدالتی بحث و مباحثہ کا موضوع بنانے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ یہ مضمون ہم برطانیہ سے شائع ہونے والے جریدے ماہنامہ "صراط مستقیم" کے شکریئے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

سوال :

شیخ محترم! آپ سے یہ امر مخفی نہیں کہ افغانستان کے معرکہ میں ایسے دو گروہ اور فرقے بھی شامل ہیں جو افغانستان کی تباہی و بربادی میں روز بروز اضافے کا باعث بن رہے ہیں۔ افسوس کہ یہ فرقے جہاد میں مصروف ہمارے سلفی نوجوانوں میں ایسے افکار و نظریات کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں جو سلف صالح کے منہج سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے بعض سلفی نوجوان جو ان آراء و نظریات سے متأثر ہیں، جہاد کے بعد جب اپنے وطن واپس آتے

ہیں تو یہ افکار اپنے ملکوں میں بھی پھیلاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اور اخوان میں سے کسی کے مابین تکفیر کے مسئلہ پر ایک طویل مناقشہ ہوا ہے جو ٹیپ ہے لیکن کیسٹ کی خرابی کے سبب اسے سنا نہیں جا سکتا۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت دوبارہ فرمادیں۔ فجزاکم اللّٰہ خیرًا

جواب :

اِنّ الحمدَ للّٰہ نَحمدہٗ وَنستعینہٗ وَنستغفرہٗ وَنعوذ باللّٰہِ مِن شُرورِ اَنفُسنا ومِن سیّئاتِ اعمالِنا' مَن یھدِہِ اللّٰہُ فلا مُضِلَّ لہ' وَمن یُضلِل فلا ھادِیَ لہٗ وَاَشھد اَن لاالٰہ الا اللّٰہ وحدَہٗ لاشریکَ لہٗ وَاَشھدُ انَّ محمدًا عبدُہ ورسولُہ۔ امّابعد :۔

اصل میں یہ مسئلہ تکفیر حکام ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ محکومین کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ دراصل ایک قدیم فتنہ ہے جس کی بنیاد اسلامی فرقوں میں سے ایک فرقہ خوارج نے رکھی ہے۔ یہ بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ لوگ پھر کتاب و سنت سے خروج کر رہے ہیں اور وہ بھی کتاب و سُنّت کے نام سے۔ میری سمجھ و دانست میں اس کی دو بنیادی وجہیں ہیں جن میں سے ایک وجہ علم کی کمی اور دینی بصیرت کا فقدان ہے۔ دوسری وجہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے' وہ یہ ہے کہ ہم مسائل و معاملات میں ان شرعی اصولوں کی روشنی میں غور و خوض نہیں کرتے جو صحیح اسلامی دعوت کی اساس ہیں۔ ان اصولوں کو وہ تمام منحرف فرقے بھی مانتے ہیں جنہوں نے اس مخصوص جماعت سے خروج کیا ہے جس کی تعریف رسول اللہ ﷺ نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے بلکہ خود اللہ عزّ و جل نے جس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اس کی صراحت فرمادی ہے کہ جو اس جماعت سے خروج کرے گا وہ اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہو گا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

﴿ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ ﴾ (النساء : ۱۱۵)

"اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہو جانے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا اور راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ بری جگہ ہے"۔

چنانچہ اللہ عز و جل نے ایک ایسے مسئلہ میں جو اہل علم کے نزدیک بہت واضح ہے صرف "وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى" کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "مشاقّة الرسول" کے ساتھ ساتھ "اتّباع غیر سبیل المومنین" کا بھی اضافہ کیا اور فرمایا : ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء : ۱۱۵)

مسئلہ فہم کتاب و سنّت

لہٰذا "سبیل المومنین" کی اتباع و عدم اتباع ایجاباً و سلباً دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے۔ رب العالمین کے نزدیک جو سبیل المومنین کی اتباع کرے گا وہ ناجی ہو گا اور جو اس کی مخالفت کرے گا تو اس کے لئے جہنم کافی ہو گا جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔

اسی نقطہ پر پہنچ کر قدیم و جدید فرقے گمراہ ہوئے ہیں، کیونکہ وہ سبیل المومنین پر کاربند نہیں رہ سکے اور اپنی عقلوں کو انہوں نے اپنا مرکب بنالیا اور کتاب و سنت کی تفسیر میں وہ خواہشات کی اتباع میں پڑ گئے اور پھر اس پر بڑے اہم نتائج کی بنا رکھ لی اور اس روش کو چھوڑ بیٹھے ہیں جس پر سلف صالح گامزن تھے۔

اس آیت میں "وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ" کا جو ٹکڑا آیا ہوا ہے اس پر اللہ کے نبی ﷺ نے بہت سی احادیثِ صحیحہ میں زور دیا ہے۔ جن احادیث کی جانب میں یہاں اشارہ کر رہا ہوں ان میں سے چند کا، جن کے سلسلہ میں میری یادداشت میرا ساتھ دے گی، میں یہاں ذکر کروں گا۔ ان احادیث سے عوام بھی اچھی طرح واقف ہیں، چہ جائیکہ خواص۔ البتہ جس بات سے لوگ ناواقف ہیں یہ اس آیت کا کتاب و سنت کے فہم میں سبیل المومنین پر کاربند رہنے کی ضرورت و اہمیت پر دلالت کرنا ہے۔ یہ نکتہ بہت سے

خواص تک کے ذہنوں سے اوجھل ہے، چہ جائیکہ وہ لوگ جو جماعت التکفیر کے نام سے موسوم ہیں۔

یہ لوگ اپنی داخلی کیفیات کے اعتبار سے کبھی کبھی مخلص ہوتے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک ناجی اور فلاح یاب گروہ ہونے کے لئے صرف نیک و مخلص ہونا کافی نہیں، بلکہ اس سلسلہ میں مسلمان کے لئے دو چیزوں کا جامع ہونا ضروری ہے۔ ایک تو اخلاصِ نیت اور دوسرے رسول اللہ ﷺ کے راستے کی سچی اور مکمل پیروی۔ لہٰذا مسلمان کے لئے اخلاص کے ساتھ کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونا اور لوگوں کو ان دونوں کی دعوت دینا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے منہج کا حامل ہو جو صحیح و درست اور انحرافات سے مامون و محفوظ ہو۔

جن احادیثِ مشہور کی جانب میں نے ابھی اشارہ کیا ہے ان میں "اِثْنَتَینِ وسَبْعِینَ فرقَةً" والی روایت بھی شامل ہے جس کے پورے الفاظ اس طرح ہیں :

اِفْتَرَقتِ الیھودُ علٰی اِحدٰی وَسبعینَ فرقةً وَافترقتِ النصارٰی علی اثنتینِ وسبعینَ فرقةً وستفترق اُمتی علٰی ثلاثٍ وسبعینَ فرقةً کلُّھا فِی النَّارِ اِلّا واحدة۔ قَالُوا : ومَن ھِی یارسولَ اللّٰهِ؟ قال : اَلْجَماعةُ

(ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

"یہود ا۷ فرقوں میں بٹ گئے تھے اور نصاریٰ ۷۲ فرقوں میں اور عنقریب میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی، جن میں سے سب جہنمی ہوں گے، سوائے ایک فرقہ کے لوگوں کے۔ لوگوں نے پوچھا : اللہ کے رسول، وہ فرقہ کون سا ہو گا؟ آپ نے فرمایا : وہ جماعت (یعنی صحابہ اور ان کے متبعین کی جماعت) ہے"۔

اور ایک روایت میں "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِی" کے الفاظ وارد ہیں، یعنی وہ میری اور میرے اصحاب کی روش پر چلنے والا گروہ ہو گا۔

یہاں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے جواب اور مندرجہ بالا آیت کے ٹکڑے "وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیلِ الْمُؤْمِنِینَ" میں کس قدر ہم آہنگی اور تطابق پایا

جاتا ہے۔

آیت کے عموم میں سب سے پہلے جو لوگ داخل ہیں وہ اصحاب الرسول ﷺ ہیں۔ اس حدیث میں آپ نے صرف "مَا اَنَا عَلَیہ" کہنے پر اکتفا نہیں کیا جبکہ کتاب و سنت کا فہم رکھنے والے مسلمان کے لئے یہ چیز کافی ہو سکتی ہے' بلکہ آپ ﷺ نے اس کے ساتھ "وَاَصحابی" کا اضافہ بھی فرمایا۔ اس طرح آپ اللہ تعالیٰ کے فرمان "بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ" جو اس نے آپ کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں' کی عملی تصدیق فرما رہے تھے۔ آپ نے ان کے لئے اس بات کی تصریح فرمادی کہ فرقہ ناجیہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس روش کی اتباع کرتا ہو جس پر خود نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب گامزن تھے۔ لہٰذا کتاب و سنت کے فہم کے لئے عربی زبان کی معرفت اور ناسخ و منسوخ وغیرہ ضروری علوم و وسائل پر اکتفا کر لینا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جملہ معاملات میں اس روش کی طرف رجوع بھی ضروری ہے جس پر نبی ﷺ کے اصحاب گامزن تھے۔ اس لئے کہ یہ لوگ' جیسا کہ ان کے حالات اور کارناموں سے واضح ہے' اپنی عبادتوں میں سب سے زیادہ مخلص اور کتاب و سنت کے فہم میں ہم سے کہیں آگے تھے۔ یہ حدیث سنن میں وارد عرباض بن ساریہ کی حدیث کے بالکل مطابق ہے' جس میں آیا ہے :

وعَظَنَا رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ عَلیہ وسلم مَوعِظَۃً وَجِلَتْ مِنہا القلوبُ ودَرَفَتْ منہا العیونُ فقلنا : کانَّہا موعظۃُ مُوَدِّعٍ' فاَوصِنا یارسولَ اللّٰہ! قال : اُوصیکم بِالسَّمْعِ والطاعۃِ وَاِن وُلِّیَ علیکم عبدٌ حبَشیٌّ' وَاِنّہ مَن یَعِشْ منکم فسیرَی اختلافًا کثیرًا' فعلیکم بِسُنّتی وسُنّۃِ الخُلَفاءِ الرَّاشدینَ المہدِیّین مِن بعدی' عَضُّوا علیہا بِالنَّواجذ (الحدیث)

"رسول اللہ ﷺ نے ہم کو نصیحت فرمائی' ایسی نصیحت جس سے دل دہل گئے اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ہم نے کہا گویا کہ یہ رخصت کرنے والے کی نصیحت ہے تو اللہ کے رسول! آپ ﷺ ہمیں وصیت فرمائیں۔ اس پر آپ نے فرمایا : میں تمہیں

سمع و طاعت کی وصیت کرتا ہوں گو کوئی حبشی غلام ہی تمہارا امیر بنا دیا گیا ہو' اور جو تم میں سے زندہ رہے گا عنقریب بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا' پس تم میری سنت اور ان راہ یاب خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا جو میرے بعد ہوں گے"۔

اس کے بعد پوری حدیث درج ہے اور اس کے ایک شاہد کا ذکر ہے' شاہد وہی ہے جو آپ کے اوپر والے سوال کے جواب کا شاہد ہے جس میں اپنی امت کو آپؐ نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ آپ کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رہے۔ اس کے بعد آپ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "سنۃ الخلفاءِ الراشدین المھدیین" فرما کر خلفاء راشدین کی سنت کو بھی مضبوطی سے تھامنے کی ہدایت کی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس بات کو برابر دہراتے رہیں کہ اگر ہم اپنے عقیدہ' اپنی عادات اور اپنے اخلاق و سلوک کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے سلف صالح کی جانب مراجعت ضروری ہے تاکہ یہ متحقق ہو جائے کہ یہی فرقہ ناجیہ ہے۔ اسی جگہ پہنچ کر قدیم فرقے گمراہ ہوئے اور یہیں جدید عہد کے فرقے بھی آکر گمراہی کے کھڈ میں گر جاتے ہیں جب وہ مندرجہ بالا آیت اور "سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین" والی حدیث سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ لہٰذا جادۂ مستقیم سے ان کا منحرف ہو جانا ایک امر طبعی ہے جیسا کہ ان کے پیش رو' جن میں قدیم و جدید دونوں عہد کے خوارج داخل ہیں' کتاب اللہ' سنتِ رسول اور منہجِ سلف سے منحرف ہوئے۔

مسئلہ تکفیر جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے' کی بنیاد اس دور میں قرآن کریم کی ایک آیت ہے جسے یہ لوگ بکثرت دہراتے ہیں اور وہ آیت یہ ہے :

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ ۝﴾ (المائدہ : ۴۴)

"اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں"۔

یہ سب جانتے ہیں کہ اللہ نے اس آیت کریمہ کو کئی بار دہرایا ہے اور آیت کا آخری ٹکڑا ہر بار تین الگ الگ لفظوں کے ساتھ آیا ہے۔

﴿.......فَاُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴾ (المائدہ : ۴۴)
﴿.......فَاُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴾ (المائدہ : ۴۵)
﴿.......فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴾ (المائدہ : ۴۷)

جو لوگ ان تینوں آیتوں میں سے پہلی آیت کے لفظ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ سے مسئلہ تکفیر پر استدلال کرتے ہیں ان کی جہالت و نادانی یہ ہے کہ وہ دوسرے ان نصوص پر غور نہیں کرتے جن میں یہ لفظ "کفر" آیا ہوا ہے۔ اس لفظ کو ان لوگوں نے دین سے خروج کے معنی میں لے لیا ہے اور وہ اس کے کفر اور یہود و نصاریٰ اور دیگر مذاہب کے متبعین کے کفر میں کوئی فرق نہیں کرتے حالانکہ کتاب و سنت کی زبان میں لفظ "کفر" کا صرف یہی ایک مطلب نہیں جسے یہ لوگ دہراتے رہتے ہیں اور اس غلط مفہوم کو بعض ایسے لوگوں پر منطبق کر دیتے ہیں جو اس سے بری ہیں۔

اس آیت میں وارد لفظ "اَلْكَافِرُون" کا معاملہ بالکل وہی ہے جو دونوں آیتوں کے لفظ "الظَّالِمُون" اور "الفَاسِقُون" کا ہے۔ یہ تینوں الفاظ ہر جگہ ایک معنی پر دلالت نہیں کرتے۔ بنابریں جس طرح جس شخص کے بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ "یہ ظالم ہے یا فاسق ہے" تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، اسی طرح جس کے بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ "یہ کافر ہے" تو اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ ایک ہی لفظ کے مفہوم میں یہ تنوع اور رنگارنگی ہی دراصل وہ چیز ہے جس پر زبان، شریعت جو اہل عرب کی زبان میں اتری اور لغتِ قرآن تینوں دال ہیں۔

اس لئے جو شخص مسلمانوں کے لئے خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم، احکام و فتاویٰ صادر کرتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کتاب و سُنّت کے علم سے بہرہ ور ہو اور سلف صالح کے منہج پر کاربند ہو۔

کتاب و سنت اور کتاب و سنت پر مشتمل امور کا فہم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عربی زبان اور اس کے آداب کی گہری معرفت حاصل نہ ہو اور اگر طالب علم میں اس پہلو سے کوئی کوتاہی ہو تو اس کی تلافی علمائے سلف کے فہم کی طرف مراجعت ہی سے ممکن ہو سکتی ہے، بالخصوص ان علماء کے فہم کی طرف جن کا تعلق قرونِ مشہود لہا بالخیر سے ہو۔

کفر کے مختلف درجے ہیں

اب ہم آیت کریمہ ﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ (المائدہ : ۴۴) کی طرف دوبارہ لوٹتے ہیں۔ اس آیت میں کفر سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد دائرہ اسلام سے خروج ہے یا کچھ اور۔ یہی نکتہ اس آیت کی تفہیم میں قابل غور ہے کیونکہ کبھی کبھی کفر سے کفر اعتقادی کے بجائے کفر عملی مراد ہوتا ہے جس کے معنی اپنے عمل سے اسلام کے بعض احکام سے خروج کے ہیں۔ اس سلسلہ میں عبداللہ بن عباس، جو حبرالاُمّہ اور ترجمان القرآن کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں اور جن کا شمار رسول اللہ ﷺ کے ان اصحاب میں ہوتا ہے جن کے امام تفسیر ہونے پر تمام مسلمانوں کا (باستثناءِ چند جن کا تعلق فرق ضالہ سے ہے) اتفاق ہے، کے قول سے ہماری تصدیق ہوتی ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو آواز آج ہمارے کانوں میں پڑ رہی ہے اس کے لئے انہوں نے اسی وقت کان کھڑے کر لئے تھے کہ کچھ ایسے لوگ بھی پائے جا سکتے ہیں جو آیت کو اس کے ظاہری معنی پر بغیر کسی تفصیل کے محمول کریں گے۔ لہٰذا "كُفْرٌ دُوْنَ كُفْرٍ" کہہ کر انہوں نے اس کی تصریح کر دی کہ یہاں وہ کفر مراد نہیں ہے جس کے قائل تم ہو، یہ اس سے کمتر درجہ کا کفر ہے۔

ہو سکتا ہے اس سے مراد یہی خوارج کا گروہ رہا ہو جس نے امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خروج کیا اور جس کے نتیجہ میں اس نے مسلمانوں کی خونریزیاں کیں اور آن کے ساتھ وہ سب کچھ روا رکھا جسے مشرکین کے ساتھ بھی وہ روا نہیں رکھ سکا۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے صاف صاف اس کی وضاحت فرمادی کہ یہ بات ہرگز اس طرح نہیں جیسے یہ لوگ کہتے یا سمجھتے ہیں، بلکہ یہ اس کفر سے جس سے انسان دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے کمتر درجہ کا کفر ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ترجمان القرآن حضرت ابن عباس کا یہ واضح اور دوٹوک جواب ہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کے علاوہ ان نصوص سے جن کی طرف اس گفتگو کے آغاز میں میں نے اشارہ کیا تھا کہ کوئی اور چیز سمجھا جانا ممکن نہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لفظ "کفر" بہت سے نصوص میں آیا ہوا ہے، اس کے ساتھ اس بات

میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کی تفسیر ہر جگہ دائرہ اسلام سے خروج سے کیا جانا ممکن نہیں۔ اس کی مثال عبد اللہ بن مسعود سے مروی صحیحین کی ایک مشہور روایت ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سِبابُ المسلِم فسوقٌ وقتالہٗ کفرٌ"... کفر کے معنی اس حدیث میں معصیت کے ہیں اور معصیت اطاعت سے خروج کو کہتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ چونکہ "افصح العرب" تھے اس لئے آپ نے زجر میں مبالغہ کے لئے تعبیر میں تنوع کے اس طریقہ کو اختیار کیا اور فرمایا: "سِبابُ المسلِم فسوقٌ وقتالہٗ کفرٌ"۔۔ ایک دوسرے پہلو سے ہم اس حدیث پر غور کریں، کیا ہمارے لئے اس حدیث کے پہلے ٹکڑے "سِبابُ المسلِم فسوقٌ" کی تفسیر اس لفظ "فسق" سے کرنی ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت کے تیسرے لفظ میں آیا ہوا ہے۔

جواب یہی ہوگا کہ فسق کا لفظ بھی کبھی اس کفر کا مترادف ہوتا ہے جس کے معنی دائرہ اسلام سے خروج کے ہیں اور کبھی اس کفر کے جو اس سے کمتر ہوتا ہے۔

یہی مطلب ہے ترجمان القرآن عبد اللہ بن عباس کے قول "کفر دون کفر" کا کہ یہ ایسا کفر ہے جو اس کفر سے کم درجہ کا ہے جس کے معنی دائرہ اسلام سے خروج کے ہیں۔ یہ حدیث نہایت پرزور انداز سے یہ ثابت کرتی ہے کہ لفظ کفر کبھی کبھی فسق اور معصیت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ (الحجرات: ۹)

میں لفظ "بَغَتْ" کو معصیت ہی کے معنی میں ذکر کیا ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ عزوجل نے اس باغی گروہ کا ذکر کیا ہے جو حق پر قائم رہنے والے اہل ایمان کے گروہ سے برسرپیکار ہو، اس کے باوجود اس باغی گروہ پر کفر کا حکم نہیں لگایا گیا ہے، جب کہ حدیث صاف کہہ رہی ہے قِتالُہٗ کُفرٌ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قتالہ کفر میں کفر سے مراد وہ کفر نہیں ہے جس کے معنی دائرہ اسلام سے خروج کے ہیں بلکہ یہ کفر اس سے کم درجہ کا ہے جیسا کہ ابن عباس نے اوپر والی آیت کریمہ کی تفسیر کے ضمن میں اس کی وضاحت کی ہے، لہٰذا مسلمان کا

مسلمان سے قتال کرنا بغی، اعتداء، فسق اور کفر تو ہے لیکن یہ کفر کفرِ اعتقادی نہیں کفرِ عملی ہے۔

یہیں سے یہ نازک نکتہ نکلا ہے جس کی وضاحت امامِ حق شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے تلمیذ رشید علامہ ابن القیم الجوزیہ نے فرمائی ہے۔ ان دونوں نے کفر کی اس تقسیم کا بار بار اعادہ و اظہار کیا ہے "جس کا علم ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس کے اس مختصر اور جامع لفظ کفر دون کفر کے ذریعہ انہیں ہوا تھا"۔ اس لئے کفر عملی اور کفر اعتقادی میں تفریق لازمی ہے۔ اگر یہ فرق نہیں کیا گیا تو مسلمان غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی تکفیر کے فتنہ میں گرفتار ہوتے رہیں گے جیسا کہ قدیم عہد کے خوارج اور موجودہ دور کے بعض نامعقول لوگ جو ان کی روش پر چل رہے ہیں اس فتنہ میں برابر ملوث رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد "وَقِتَالُهُ كُفْرٌ" میں کفر سے دائرہ اسلام سے خروج مراد نہیں ہے۔ اس کی تائید میں بہ کثرت روایتیں موجود ہیں۔ اگر کوئی ذخیرۂ احادیث میں وارد ان روایات کو ڈھونڈ کر ایک جگہ جمع کر دے تو ایک مفید رسالہ تیار ہو جائے گا۔

اس میں ان لوگوں کے خلاف دلیل قطعی ہے جو مذکورہ بالا آیت پر توقف کرتے اور اس کی تفسیر لازماً کفر اعتقادی سے کرتے ہیں۔ بنا بریں تنہا یہی روایت ہمارے موقف کی تائید کے لئے کافی ہے کیونکہ یہ اس امر پر دلیل قاطع ہے کہ مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی سے لڑنا کفر ہے اور یہ کفر کفر عملی کے معنی میں ہے نہ کہ کفر اعتقادی کے۔

اس کے بعد جب ہم "جماعتِ تکفیر" کی طرف اور ان کے اس اطلاق کی طرف جسے وہ مسلمان حکام اور ان کے پرچم کے نیچے زندگی گزارنے والوں بالخصوص ان کے زیر سایہ رہنے والوں اور ان کی ماتحتی میں کام کرنے والوں پر روا رکھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ معاصی کے مرتکب ہیں اس لئے کافر ہیں۔

"جماعتِ تکفیر و ہجرت" کے تعلق سے کچھ باتیں

منجملہ ان امور کے جن کا ذکر سائل نے ابھی ہم سے کیا ہے ہم نے کچھ لوگوں سے جو

جماعتِ تکفیر سے وابستہ تھے پھر اللہ نے انہیں ہدایت کی توفیق دی، کچھ باتیں سنیں۔ ہم نے ان سے کہا فرض کیجئے آپ نے بعض حکام کو کافر کہہ دیا، لیکن یہ بتایئے کہ حکام کے علاوہ دیگر لوگوں مثلاً مساجد کے ائمہ و خطباء اور مؤذنین وغیرہ کو آپ کافر کیوں کہتے ہیں؟ اسی طرح دینی مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ کی کیوں تکفیر کرتے ہیں؟ تو وہ کہنے لگے کہ ان لوگوں کو کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ان حکام کے فیصلوں کو مان لیتے ہیں جو "غیر ما انزل اللّٰہ" سے فیصلے کرتے ہیں۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ کفر عملی کفر اعتقادی میں اس وقت بدلتا ہے جب یہ رضائے قلبی ہو۔ اب آپ بتایئے کہ کون سا حاکم ایسا ہے جو "ما انزل اللّٰہ" کے علاوہ سے فیصلہ کرتا ہو اور وہ یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس کا فیصلہ ہی فی زمانہ قابل قبول ہے اور کتاب وسُنّت میں وارد منصوص حکم شرعی ماننے کے لائق نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو اس کا یہ کفر کفرِ اعتقادی ہے، کفرِ عملی نہیں۔ لیکن اولاً آپ تمام حکام یا بیشتر حکام پر جو مغربی آئین و قوانین کی رو سے فیصلے کرتے ہوں یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ اگر ان سے پوچھا جائے تو وہ لازماً جواب میں یہی کہیں گے کہ ان کا فیصلہ ہی حق و انصاف اور اس عہد کے تقاضوں کے مطابق ہے اور اسلامی قوانین کی رُو سے کیا گیا فیصلہ درست نہیں۔

اگر وہ یہ پوچھے جائیں تو آپ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا جواب یہی ہو گا کہ اس عہد میں "مَا اَنْزَلَ اللّٰہ" سے فیصلہ درست نہیں۔ اگر انہوں نے ایسا کہا تو بلاشبہ وہ کافر ہیں۔ پھر جب آپ رعایا اور محکومین کی سطح پر اتر کر غور کریں تو ان میں آپ کو علماء اور صلحاء بھی نظر آئیں گے۔ پھر محض اس وجہ سے کہ وہ ایک ایسی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں جس کی ماتحتی میں انہی کی طرح آپ بھی ہیں، آپ ان کی تکفیر کیونکر کر سکتے ہیں اور انہیں کیسے برسرعام کافر کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی مرتد کے معنی میں۔ یہ صحیح ہے کہ "مَا اَنْزَلَ اللّٰہ" ہی سے فیصلہ کرنا واجب ہے، لیکن محض عمل سے حکم شرعی کی مخالفت اس بات کو مستلزم نہیں کہ اس کے کرنے والے پر مرتد ہونے کا حکم داغ دیا جائے۔

منجملہ ان مناقشات کے جن سے ان کی غلطی اور گمراہی واضح ہو جاتی ہے ہم نے ان سے کہا کہ آپ اس مسلمان پر جو "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ" کی گواہی دیتا

ہو اور کبھی کبھی خواہ کم یا زیادہ نماز پڑھ لیتا ہو' ارتداد کا حکم کب لگائیں گے؟ کیا اس کے لئے ایک دفعہ "غیر ما انزل اللّٰہ" سے فیصلہ کر لینا کافی ہو جائے گا یا یہ ضروری ہو گا کہ وہ اپنی زبانِ قال یا حال سے اس کا اعلان کرے کہ وہ دین سے مرتد ہو گیا ہے' تو ان سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ پھر میں مجبور ہوا کہ انہیں ایک مثال سے سمجھاؤں۔ میں نے کہا فرض کیجئے کہ ایک حاکم جس کی عام عادت یہ ہو کہ وہ از روئے شرع ہی فیصلہ کرتا ہو لیکن ایک بار اس کا قدم پھسل جاتا ہے اور وہ ایک مسئلہ میں خلافِ شرع فیصلہ دے دیتا ہے یعنی حق ظالم کو دے دیتا ہے اور مظلوم محروم رہ جاتا ہے' کیا یہ "غیر ما انزل اللّٰہ" سے فیصلہ ہے یا نہیں؟ آپ یقیناً یہی کہیں گے کہ ہاں ہے۔ اب آپ یہ بتائیے کہ کیا آپ اس قاضی کے متعلق یہ کہیں گے کہ وہ کافر اور مرتد ہو گیا؟ انہوں نے کہا نہیں' ہم اس پر کافر و مرتد ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے۔ اس پر ہم نے ان سے پوچھا کیوں نہیں؟ تو انہوں نے کہا' کیونکہ اس سے صرف ایک ہی بار ایسا ہوا ہے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے' فرض کیجئے پھر وہ دوبارہ یہی یا اس طرح کا کوئی فیصلہ خلاف شرع کر دیتا ہے' کیا وہ کافر ہو جائے گا؟ اور میں لگا اسے دہرانے کہ اس نے تیسری اور چوتھی دفعہ بھی اسی طرح خلاف شرع فیصلہ دیا تو آپ اسے کب کافر کہیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کے خلاف شرع فیصلوں کی تعداد کی کوئی حد متعین نہیں کر سکتے۔ اس کے برخلاف اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص "غیر ما انزل اللّٰہ" سے فیصلہ کرنے کو مستحسن سمجھتا ہے اور فیصلۂ شرعی کو قبیح گردانتا ہے تو بلا جھجک آپ اس پر ارتداد کا حکم لگا سکتے ہیں۔

اس کے برعکس آپ اسے دسیوں خلافِ شرع فیصلے کرتے دیکھتے ہیں لیکن جب آپ اس سے پوچھتے ہیں کہ تم "غیر ما انزل اللّٰہ" سے کیوں فیصلے دیتے ہو تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے یا میں نے اس سے رشوت لے لی ہے (اور یہ پہلے سے بھی زیادہ ہے) تو آپ اس کی تکفیر نہیں کر سکتے جب تک وہ یہ ظاہر نہ کر دے کہ وہ "ما انزل اللّٰہ" سے فیصلہ کرنے کو درست نہیں سمجھتا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ کفر' فسق اور ظلم' ان تینوں کی دو دو قسمیں ہیں' ایک کفر' فسق اور ظلم وہ ہے جس کے ارتکاب سے انسان دائرۂ اسلام سے نکل جاتا ہے' جس کے معنی یہ

ہوتے ہیں کہ وہ اس کام کو دل سے حلال جانتا ہے۔ دوسری قسم اس کے برعکس ہے، جس کے معنی قلبی استحلال کے بجائے عملی استحلال کے ہوتے ہیں۔

عُصاۃ کی تکفیر جائز نہیں

عُصاۃ بالخصوص عملی استحلال کے قبیل کی برائیوں مثلاً سود، زنا، شُربِ خمر وغیرہ جو اس دَور میں عام ہیں، کے مرتکبین کو محض ان برائیوں کے ارتکاب اور عملی استحلال کی وجہ سے کافر کہنا جائز نہیں۔ الایہ کہ ان کی طرف سے یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ اسے حلال سمجھتے ہیں اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے انہیں حرام نہیں مانتے۔ اگر ان کی اس قلبی مخالفت کا پتہ چل جائے تو بلا دریغ ان پر ارتداد اور اسلام سے خروج کا حکم لگایا جا سکتا ہے، لیکن اگر یہ معلوم نہ ہو سکے تو ان کی تکفیر قطعاً درست نہیں، کیونکہ خطرہ ہے کہ ہم خود نبی ﷺ کے فرمان:

اِذَا قَالَ الرَّجلُ لاخیہِ یَا کافر فقد باءَ بِھَا اَحَدُھُمَا

(جب آدمی اپنے بھائی کو "اے کافر!" کہتا ہے تو یہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف ضرور پلٹتا ہے۔)

کی وعید میں داخل نہ ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو اس معنی میں وارد ہیں۔ اس تعلق سے ہم یہاں اس صحابی کا واقعہ ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو ایک مشرک شخص سے مصروفِ قتال تھے، جب اس مشرک نے دیکھا کہ وہ مسلمان صحابی کی تلوار کی زد میں آگیا ہے تو اس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھ دیا، لیکن صحابی نے اس کے کلمہ پڑھنے کی پرواہ نہیں کی اور اسے قتل کر دیا۔ جب نبی ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو آپ نے اس پر اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر اس صحابی نے یہ عذر پیش کیا کہ اس نے قتل کے ڈر سے یہ کہا تھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ھَلَّا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِہٖ؟ (تم نے کیوں اس کا دل پھاڑ کر نہیں دیکھ لیا؟) آپ نے یہ جملہ اس لئے فرمایا کیونکہ کفر اعتقادی کا عمل سے کوئی علاقہ و رشتہ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق صرف دل سے ہوتا ہے اور ہم فاسق اور فاجر، زانی اور سارق اور سود خور کے دل کی بات نہیں جان سکتے، اِلّا یہ کہ وہ زبان سے اس کا

اظہار کردے۔ رہا اس کا عمل تو اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے عمل سے شریعت کی مخالفت کی ہے۔ اس پر ہم اس سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ تم نے شریعت کی مخالفت کی ہے اور فسق و معصیت کا کام کیا ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ تُو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا' جب تک اس سے کوئی ایسی چیز ظاہر نہ ہو جائے جو اللہ کے نزدیک اس پر ارتداد کا حکم لگانے کے لئے عذر بن سکے۔ اسی وجہ سے اسلام میں ظاہر و معروف ہی پر حکم لگتا ہے' جیسے آپ کا ارشاد "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا نبوی منہاج

اس کے ساتھ ان لوگوں سے جو مسلمان حکام کی تکفیر کرتے ہیں' میں برابر یہ کہتا رہا ہوں کہ فرض کیجئے یہ حکام کافر اور مرتد ہیں تو آپ اس کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ کفار بلادِ اسلام پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اور ہم فلسطین پر یہود کے غاصبانہ قبضے کے صدمہ سے برابر تڑپ رہے ہیں' لیکن ہم اور آپ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر آپ ان حکام کا جنہیں آپ کافر کہتے ہیں کیا بگاڑ لیں گے؟ آپ ان باتوں کو نظر انداز کر کے وہ بنیادی کام کیوں نہیں شروع کرتے جس پر اسلامی حکومت کی بناء رکھی جا سکے؟ اور وہ کام رسول اللہ ﷺ کی سنت کی اتباع ہے جس پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت کی تربیت کی تھی اور جس کے اصول و اساس پر انہیں پروان چڑھایا تھا۔ اس قسم کے مناسبات پر میں بار بار اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ مسلمان تنظیموں اور جماعتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف ارض اسلام ہی پر نہیں بلکہ روئے زمین پر اسلامی حکومت کی بحالی کے لئے صدق دل سے کام کریں تا کہ اللہ کا فرمان: ﴿ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ (الصف : ۹) عملی طور پر صادق آسکے اور مسلمان اس نصِ قرآنی میں کئے گئے وعدہ کو اپنے عمل سے سچ کر دکھائیں کیونکہ بعض صحیح احادیث میں وارد ہے کہ اس آیت میں دین کے جس غلبہ کا ذکر ہے اس کا اتمام بعد میں ہو گا۔ کیا اس کا راستہ ان حکام کے خلاف ہے جنہیں یہ کافر و مرتد کہتے ہیں۔ صرف بغاوت کا اعلان رہ گیا

ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک غلط خیال ہے اور اپنے اس غلط خیال کے ساتھ وہ غلبہ اسلام کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر آخر اس کا صحیح راستہ کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا راستہ وہی ہے جس کا اظہار رسول اللہ ﷺ اپنے خطبہ میں بار بار اپنے اصحاب سے کرتے تھے: وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اور بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے۔"

لہٰذا جملہ مسلمانوں بالخصوص ان تمام لوگوں پر جو اپنی توجہ اسلامی حکومت کی بحالی پر مرکوز رکھتے ہیں لازم ہے کہ اس کام کا آغاز وہیں سے کریں جہاں سے رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا اور وہ دو چیزیں ہیں جنہیں ہم "تصفیہ" اور "تربیت" کا ہلکا پھلکا نام دے سکتے ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے کہ ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں جس سے غلو پسند، جن کا کام سوائے حکام کی تکفیر کے کچھ اور نہیں، یا تو غافل ہیں یا جان بوجھ کر اس سے غفلت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ تو اپنی اس حرکت سے باز نہیں آ سکتے اور حکام کے خلاف کفر کے فتوے برابر داغتے رہیں گے، جس سے بدامنی اور شورش کے ان واقعات کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا جو ادھر چند سالوں سے پیش آ رہے ہیں اور جن کی ابتداء حرم کے حادثہ سے ہوئی تھی اور جس کا سلسلہ فتنۂ مصر، انور سادات کے قتل اور بہت سے بے قصور مسلمانوں کی جانوں کے ضیاع تک وسیع ہے اور اس کے بعد شام اور افسوس اب پھر مصر اور الجزائر میں یہی واقعات برابر دہرائے جا رہے ہیں۔ ان سب چیزوں کی اصل وجہ دراصل کتاب و سنت کے بہت سے نصوص کی مخالفت ہے جن میں سب سے اہم اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا﴾

(الاحزاب: ۲۱)

اگر ہم زمین پر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو کیا اس کی ابتداء ہم حکام سے قتال کے ذریعے کریں گے یا ہم اس کی شروعات وہاں سے کریں گے جہاں سے رسول اللہ ﷺ نے اس کی شروعات کی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا جواب یہی ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے کس چیز سے ابتداء کی تھی۔

آپ بخوبی اس بات سے واقف ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کی ابتداء ان افراد کے درمیان کی تھی جن کے متعلق آپ ﷺ یہ سمجھتے تھے کہ ان میں قبولِ حق کی استعداد موجود ہے۔ پھر آپ ﷺ کی دعوت کو جنہوں نے قبول کیا، جیسا کہ سیرتِ نبوی سے جو لوگ واقف ہیں انہیں معلوم ہے، اور پھر اس کے بعد مکہ کے مسلمانوں پر ایذا رسانی اور دار و گیر کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا اور پھر ہجرتِ اولیٰ اور پھر ہجرتِ ثانیہ کا حکم ملا اور ایذا رسانی کا یہ سلسلہ جاری رہا، تا آنکہ مدینہ منورہ میں اللہ نے مسلمانوں کو استحکام و استقرار بخشا، پھر دشمنانِ اسلام سے جھڑپوں کی ابتداء ہوئی اور اس کے بعد ایک طرف مسلمانوں اور کافروں میں اور دوسری طرف مسلمانوں اور یہودیوں میں معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم بھی اس کی ابتداء اسلام کو لوگوں میں عام کرنے سے کریں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا، لیکن ہمارے لئے اسلام کی نشر و اشاعت ہی پر اکتفا کر لینا کافی نہ ہوگا کیونکہ اسلام میں بہت سے ایسے اجنبی عناصر کی آمیزش ہو گئی ہے جن کا اسلام سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ باہر سے آکر اس میں دخیل ہو گئے ہیں جو اسلام کی شاندار عمارت کے انہدام کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اسلام کے داعیوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ اسلام کو ان اجنبی عناصر سے پاک و صاف کرنے کے عمل کا بھی آغاز کریں۔

تصفیہ و تطہیر کے اس عمل کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جو اہم ہے وہ خالص اسلام کے نام سے جو جماعتیں اور تنظیمیں وجود میں آئی ہیں جب ہم ان کے کاموں کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان جماعتوں نے اس پہلو سے کوئی خاص استفادہ نہیں کیا ہے، سوائے یہ چیخنے چلانے کے کہ وہ اسلامی حکومت کا قیام چاہتی ہیں۔ اپنی اسی دلیل سے انہوں نے بہت سے معصوموں کے خون سے ہولیاں کھیلیں۔ ان کے کتاب و سنّت سے متصادم عقائد و نظریات کی گونج برابر ہمارے کانوں میں سنائی دیتی رہی ہے۔

یہاں اس کی مناسبت سے ہم ایک داعیٔ اسلام کی بات کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ

(باقی صفحہ ۵۷ پر ملاحظہ کیجئے)

نفاق کی نشانیاں (۶)

تالیف : فضیلۃ الشیخ الاستاذ عائض عبداللہ القرنی
ترجمہ و حواشی : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

پچیسویں نشانی

اللہ اور رسول ﷺ کے وعدے کو جھٹلانا

اللہ تعالیٰ منافقوں کے الفاظ دہراتے ہیں کہ وہ لوگ کہتے ہیں :

﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۝﴾ (الاحزاب : ۱۲)

"اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے"

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر حضور اکرم ﷺ صحابہ کے ہمراہ خندق کی کھدائی میں شریک تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خندق کھود رہے تھے کہ حضور اکرم ﷺ کو ایک پتھر دکھایا گیا۔ آپ ﷺ بذات خود کدال لے کر اسے توڑنے لگے۔ آپ نے ایک چوٹ لگائی تو اس سے چنگاری نکلی۔ آپ نے دوسری چوٹ لگائی تو اس سے دوسری چنگاری نکلی۔ آپ نے فرمایا : مجھے دو خزانے دکھائے گئے ہیں 'ایک سرخ دوسرا سفید' اور یہ دونوں خزانے میری امت کو ملیں گے۔ خندق کے اردگرد موجود منافقوں نے آنکھوں کے اشاروں سے ایک دوسرے کو پیغام دیا کہ دیکھو ہمیں کسریٰ و قیصر کے خزانوں کی امید دلا رہے ہیں اور ادھر حال یہ ہے کہ ہم ڈر کے مارے پیشاب کے لئے نہیں نکل سکتے۔ اللہ تعالیٰ ان منافقوں کی گفتگو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں :

﴿وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا﴾ (الاحزاب : ۱۲)

"یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔"

منافقوں کی بدظنی کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے قیصر و کسریٰ کی فتح کا وعدہ پورا کر دکھایا اور امّتِ اسلام کی مدد فرمائی۔ بالآخر رسول اللہ ﷺ نے مشرق و مغرب میں فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة!!

چھبیسویں نشانی

ظاہری جسم کا خوب اہتمام اور

باطن کے متعلق لاپرواہی کرنا

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے :

"مردانِ قوم کے جسم تو خوب لمبے چوڑے ہیں۔ جسم اگرچہ خچروں جیسے ہیں لیکن سوچ چڑیوں جیسی ہے۔"

ان کا ظاہری رکھ رکھاؤ بہت خوبصورت ہوتا ہے' لیکن اندرونی حالت تباہ حال' برباد اور بگڑی ہوئی ہوتی ہے۔ ہم اس بات کی دعوت بھی نہیں دیتے کہ انسان بالکل مست قلندر ہو جائے' اسلام کا اس طرح کی قلندری سے کوئی واسطہ نہیں' بلکہ خوبصورت کپڑے پہنے' عطر لگائے اور جو بہتر سے بہتر اللہ کی دی ہوئی نعمت میسر ہو اس سے فائدہ اٹھائے۔ اللہ خود خوبصورت ہے اور خوبصورتی پسند فرماتا ہے' اپنے بندے پر نعمت و احسان کے اثرات دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بندے کا یہ بھی فرض ہے کہ ذکر' مراقبہ' اخلاص' توکّل' عبادت اور اللہ کے ساتھ سچے معاملے کے ذریعے اپنے باطن کو بھی خوبصورت بنائے تاکہ ظاہر کی خوبصورتی کے ساتھ باطن کی طہارت و پاکیزگی بھی جمع ہو

جائے، پھر تو نورٌ علیٰ نور ہو جائے گا۔

ہاں البتہ جو لوگ باطن کو بھول کر صرف ظاہر پر توجہ دیتے ہیں، نماز، مراقبہ اور ذکر کے قریب تک نہیں جاتے، یہ لوگ واقعتاً اللہ سے دور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے :

﴿ وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ، وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ، كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ﴾ (المنافقون : ۴)

"انہیں دیکھو تو ان کے جثے تمہیں بڑے شاندار نظر آئیں گے، بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ، مگر اصل میں یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں جو دیوار کے ساتھ چن کر رکھ دیئے گئے ہیں۔"

چنانچہ یہ آیت ظاہر کر رہی ہے کہ ظاہری بود و باش کے معاملے میں ان کا اہتمام خوب ہے اور اسی طرح گفتگو کرنے اور باتیں بنانے میں ان کا جواب نہیں، البتہ ہیں وہ چنی ہوئی لکڑیوں کی طرح بے حرکت و بے فائدہ۔

ابو الفتح البستی شاعر کہتا ہے :

"اے جسم کے خادم، تو اس جسم کی راحت و سکون کے لئے کس قدر محنت کرتا ہے اور جس کام میں خسارہ ہی خسارہ ہے اس میں اپنے جسم کو تھکا مارتا ہے۔ روح پر توجہ دو اور اس کے فضل و کمال کو مکمل کرنے کی کوشش کرو۔ انسان اس جسم کی وجہ سے نہیں بلکہ روح کی وجہ سے انسان کہلاتا ہے۔"

ستائیسویں نشانی

چرب زبانی اور متکبرانہ گفتگو

منافقوں کی عادت ہے کہ تکبر، ذاتی بڑائی اور گھمنڈ کی خاطر فصیحانہ تیز طرار اور آپے سے بڑی باتیں بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں :

﴿ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ﴾ (المنافقون : ۴)

"وہ (منافق لوگ) اگر بولیں تو تم ان کی باتیں سنتے رہ جاؤ"۔

حضور اکرم ﷺ نے چرب زبان اور تیز طرار باتیں بنانے والے کی مذمت کی ہے۔ یعنی جو آدمی تکبر' ذاتی بڑائی اور لوگوں میں نمایاں نظر آنے کے لئے اس طرح باتیں کرے کہ نہ صرف حروف کو تکلّف کے ساتھ مخارج سے ادا کرے' بلکہ انہیں غیر ضروری طور پر کھینچے بھی' اور باآوازِ بلند بات کرے' اور محفل میں زبردستی کی فصیحانہ گفتگو کرے ---اور پُر تکلف باتیں بنائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "ہمیں پر تکلف باتوں سے منع کیا گیا ہے"۔ بے جا تکلف نفاق کی علامت ہے۔ ہمیں اس سے بچ کر رہنا چاہئے۔

"جھجک اور حیا ایمان کے دو جزو ہیں اور اس کے بالمقابل فحش گوئی اور بے لحاظ بات کر دینا نفاق کے دو جزو ہیں"۔ اس کا معنی یہ ہے کہ حقیقت کو تبدیل کرنے کے لئے وہ منافق فصاحت و بلاغت کا سارا زور لگا دیتا ہے اور ایسے ایسے فارمولے اور مسلّمات بیان کرتا ہے گویا کہ اس کی بات بہت وزنی ہے اور وہ خود بہت سمجھ دار اور عقلمند ہے اور وہ نہایت مہذب اور تربیت یافتہ بھی ہے' حالانکہ اس کے پاس ایسی کوئی بھی خوبی نہیں ہوتی۔ یہ بھی نفاق کے اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے :

اٹھائیسویں نشانی

دین کی سمجھ بوجھ سے محرومی

منافقوں کا امتیازی نشان یہ ہے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ گاڑی چلانا جانتے ہیں' وہ اچھے مکینک بھی ہوتے ہیں' ساری دنیا اور اس کے اہم مراکز کی بھی انہیں خبر ہوتی ہے اور ایسی ایسی معلومات جمع کرتے ہیں جن کا اگر انہیں نقصان نہ ہو تو کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم ان سے دین کے بنیادی اصول پوچھ بیٹھو تو انہیں قطعاً خبر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝﴾ (المنافقون : ۷)

"اور لیکن منافقوں کو کسی بات کی سمجھ نہیں ہے"۔

اور حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : "جس شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ بھلائی کا فیصلہ کر لے اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا کر دیتا ہے" [۱]۔ اہل علم کہتے ہیں کہ حدیث کا مفہومِ مخالف یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا فیصلہ نہ ہو اسے تفقہ فی الدین سے محروم کر دیتے ہیں۔

مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتا ہے اور مسلسل ان معلومات میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ ہمیشہ علم اور مجالسِ علم تک محنت سے پہنچتا ہے۔ البتہ منافق پوری طرح علم سے بے نیاز رہتا ہے۔ جب لوگ کسی محفل میں نماز یا عبادت کی بات کریں تو اس کا رویّہ اس قدر بیگانہ ہوتا ہے گویا کہ وہ لوگ کسی اور زبان میں بات کر رہے ہیں۔ لیکن جب دنیوی معاملات زیر بحث ہوں، مثلاً مختلف جنسوں کے دام، بانڈز، ٹریولرز چیک، جاپانی ین یا ڈالر کا ریٹ تو پھر اس کی معلومات کے خزانے کا منہ کھل جاتا ہے۔ میرا کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مومن کو ان چیزوں کا پتہ نہیں ہونا چاہئے۔ نہیں، بلکہ ان کی خبر ہونی چاہئے اور ان سے کہیں زیادہ دینی مسائل معلوم ہونے چاہئیں۔ ہاں البتہ جو آدمی ان دنیاوی معاملات کو تو خوب جانتا ہو اور دین کے معاملے میں بالکل کورا ہو تو یہ نفاق کی علامت قرار پاتی ہے۔ وَالعیاذُ باللّٰہ

انتیسویں نشانی

تنہائی میں بے دھڑک گناہ کرنا

مومن اور منافق کی پہچان کے سلسلے میں یہ نشانی سب سے اہم ہے، کیونکہ منافق کا حال یہ ہوتا ہے کہ برے کاموں میں اللہ کے دیکھنے کی اسے قطعاً پروا نہیں ہوتی۔ البتہ جب

{۱} صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من یرد اللّٰہ بہ خیرا....
صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب النھی عن المسالۃ

لوگوں کے سامنے آتا ہے تو پارسائی اور نیکی کا جعلی چہرہ سجالیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ﴾ (النساء : ۱۰۸)

"یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے، وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں"۔

اس کے برعکس مومن تنہائی اور محفل ہر حال میں اللہ سے ڈرتا ہے، بلکہ خلوت میں تو وہ اور زیادہ اللہ سے ڈرتا ہے۔ شاعر نے خوب کہا ہے :

"جب تنہائی اور اندھیرے میں کوئی غلط کام ممکن ہو اور دل بھی گناہ کی دعوت دے رہا ہو، تو اللہ کی نگاہ اور نظر کا ہی خیال کرلو اور دل کو یہ بات سمجھادو کہ جس نے اندھیرے کو پیدا کیا ہے وہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔"

تو اے میرے بھائی! اس مذموم عادت سے بچ کر رہو۔

تیسویں نشانی

اہلِ ایمان کی مشکل پر خوش ہونا اور ان کی خوشی سے تکلیف محسوس کرنا

اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

﴿إِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ﴾ (التوبہ : ۵۰)

"تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے۔ اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم نے پہلے ہی اپنا معاملہ ٹھیک کرلیا تھا۔"

جب کسی نیک اور مومن پر مشکل آجائے تو منافق اس خبر کو پھیلاتا بھی پھرے گا اور ظاہر یہ کرے گا کہ اسے اس حادثے سے بہت تکلیف پہنچی ہے اور کہے گا کہ بس اللہ ہی مدد کرے کہ فلاں پر اس اس طرح مشکل پڑ گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور اس کو صبر دے۔

حالانکہ اندر سے اس کا دل خوشی سے پھول رہا ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کو خوشی نصیب ہو تو سخت غصے اور جھنجلاہٹ میں ہو گا اور اس خوشی کے موقع پر اس کا دل تنگ ہو رہا ہو گا۔ دلوں کے رازوں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اور صرف وہی اس بات پر قادر ہے۔

خاتمہ

ہم اپنے لئے اور آپ سب کے لئے اللہ تعالیٰ سے اس نقصان دہ مرض سے تحفظ اور بچاؤ کی درخواست کرتے ہیں۔ یہ مرض معاشرے میں بری طرح سرایت کر چکا ہے۔ نتیجتاً زمینی پیداوار اور نسلِ انسانی تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔

اے میرے دینی بھائیو! ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اپنے آپ کو منافقوں والی نشانیوں سے بچانے کی ازحد کوشش کریں۔

اور ------ بالآخر دنیا اور آخرت کی کامیابیوں سے ہمکنار ہو جائیں۔ وصلّی اللّٰہ وبارک علٰی نبینا محمدٍ وعلٰی آلہ وصحبہ اجمعین۔

بقیہ : کفر و گمراہی اور صراط مستقیم

ان کے متبعین اس کا التزام کریں اور اسے عملی جامہ پہنائیں۔ وہ فرماتے ہیں: اَقِیمُوا دولة الاسلام فی قلوبکم تقم لکم علٰی ارضکم "تم اپنے دلوں پر اسلام کی حکمرانی قائم کرو، اسلام تمہاری زمینوں پر خودبخود قائم ہو جائے گا"۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلمان جب کتاب و سنت پر مبنی اپنے عقائد صحیح و درست کر لیں گے تو ان کے عبادات اور اخلاق و سلوک بھی صحیح و درست ہو جائیں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس حکیمانہ بات کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں۔ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے صرف چیخنا چلانا رہ گیا ہے۔ شاعر نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا ہے :

ترجو النجاةَ ولم تسلک مسالکھا
انّ السفینۃ لا تجری علی الیبسِ

"تم نجات کی امید رکھتے ہو اور اس کے راستوں پر چلتے نہیں۔ یاد رکھو کشتی خشکی پر نہیں چلتی"۔

خطوط ونکات

گزشتہ شمارے میں شائع شدہ امیر تنظیم کے خطاب جمعہ کے بارے میں
سندھ سے ایک مراسلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MADARSSAH MAHDUL ISLAM
TABLEEGHEE MARKAZ SINDH

مدرسہ مهد الاسلام
تبليغي مرکز سنڌ

MAKKI MASGID, SHAH BADIUDDIN LIBRARY, ISLAMIC EDUCATIONAL INSTITUTE, PREACHING CENTRE

FOUNDER & MANAGING DIRECTOR DR. HUSSAIN BUX MEMON

Letter No. MMTMS 4291 96 DS.
REF No. M-PK-B-THT-001

Date: 10-08-96

To.

Honourable.
The Editor Sahib.
Monthly Meesaq. Lahore.
Assalam-o-Alaikum.

Thanking you very much for Meesaq. August 1996. The address of Dr. Israr Ahmad Sahib. published in the magazine on the history of Pakistani politics and the role of Islamic Tehreeks and the solution for the situation is really impressive and admirable.

Your these services to educate the Muslims of Pakistan for the future challenges and the Islamic Journalism is really appreciable.

We again thanks to the continuous issuance of monthly "Meesaq" for our Institution, where a large number of readers are waiting for their liked magazine.

Thanking you.

Yours Sincerely,
Dr. Allah Dino Memon
Secretary General

P.O. DARRO (73040), DISTRICT THATTA, SINDH, PAKISTAN. TELEPHONE #: 16 (DARRO) FAX #: 92-221-20204

صحیح نظامِ تعلیم اور پاکستان

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

تعلیم صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی۔ صحیح تعلیم صحیح قسم کا فرد پیدا کرتی ہے اور غلط تعلیم غلط قسم کا فرد، اور تعلیم کا مقصد اس کو صحیح یا غلط کرتا ہے۔ فرض کیا ایک ڈاکو چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا ایک کامیاب اور ہوشیار ڈاکو بن جائے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے بیٹے کو قفل اور سیف توڑنے اور پگھلانے، بندوق چلانے، وقت پر بھاگنے اور چھپنے اور پولیس کی گرفت سے محفوظ رہنے اور نکل آنے کی پوری پوری نظری اور عملی تعلیم دے۔ جب وہ ان طور طریقوں کا ماہر ہو جائے گا تو وہ اپنے باپ کے نزدیک تعلیم یافتہ کہلانے کا حقدار ہوگا۔ لیکن ہمارے خیال کے مطابق اس کی تعلیم صحیح نہیں ہوگی بلکہ غلط ہوگی۔ وہ ایجوکیشن (Education) نہیں بلکہ مِس ایجوکیشن (Miseducation) ہوگی، کیونکہ ہمارے نزدیک اس کی تعلیم کا مقصد غلط ہے۔

کوئی نظام تعلیم مقصد کے بغیر نہیں ہوتا، خواہ اس کا مقصد آشکار ہو یا مخفی، مذکور ہو یا غیر مذکور، شعور میں ہو یا لاشعور میں، موضوع کلام بن چکا ہو یا معہودِ ذہنی رکھا گیا ہو۔ اور یہ مقصدِ تعلیم وہی ہوتا ہے جو نظام تعلیم قائم کرنے والے کے نزدیک خود زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ زندگی کا جو مقصد بھی معلم کے ذہن میں ہوتا ہے، خواہ وہ اس کا ذکر کرے یا نہ کرے، وہ اس کے برپا کئے ہوئے نظام تعلیم کے ہر جزو پر حاوی ہو جاتا ہے، خواہ وہ جزو نصابی کتاب ہو یا معلم کا لیکچر یا درس یا مکتب کا عام ماحول۔ جس طرح کوئی نقش اس کاغذ یا کپڑے سے الگ نہیں ہو سکتا جس پر وہ بنایا گیا ہو اسی طرح کوئی نظام تعلیم اس مقصدِ حیات سے الگ نہیں ہو سکتا جس پر وہ قائم ہو، خواہ اس مقصد حیات کا ذکر نظام تعلیم کے اندر موجود ہو یا نہ ہو۔

چونکہ حضرت انسان نے مقصدِ زندگی کے مختلف نظریات قائم کئے ہوئے ہیں' لہٰذا اس کے نظام ہائے تعلیم بھی مختلف ہیں۔ دنیا میں اتنے ہی نظام ہائے تعلیم ہیں جتنے مقاصدِ حیات یا نظریاتِ زندگی۔ ہر ریاست کسی نظریہ زندگی پر قائم ہوتی ہے' لہٰذا ہر ریاست کا اپنا الگ نظام تعلیم ہوتا ہے جس کا مقصد وہی ہوتا ہے جو ریاست کا مقصد زندگی ہو۔ حکمائے تعلیم نے اس حقیقت کا اعتراف حال ہی میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فلسفہ تعلیم کا ایک نیا شعبہ وجود میں آیا ہے' جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے مختلف نظام ہائے تعلیم کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور ہر ایک کی خصوصیتیں معلوم کی جائیں۔ اس شعبۂ علم کو تقابلی تعلیم (Comparative Education) کا نام دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا ہر مقصد جو انسان کے ذہن میں آئے صحیح نہیں ہو سکتا۔ صحیح مقصدِ تعلیم جو صحیح نظام تعلیم کو پیدا کرنے والا ہو' صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس ایک مقصدِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کے علاوہ باقی تمام مقاصدِ تعلیم اور نظام ہائے تعلیم کم و بیش غلط اور بے ہودہ اور بے کار ہوں۔ جس نسبت سے کسی نظام تعلیم کا مقصد صحیح مقصدِ تعلیم سے ہٹا ہوا ہو گا اسی نسبت سے وہ نظام تعلیم غلط تعلیم یا مس ایجوکیشن (Miseducation) کا باعث ہو گا اور غلط قسم کے افراد پیدا کرے گا۔ اگر اس کا مقصد مکمل طور پر صحیح ہو گا تو وہ نظام تعلیم مکمل طور پر صحیح ہو گا اور صحیح قسم کے افراد پیدا کرے گا۔ افسوس ہے کہ مغرب کے حکمائے تعلیم مختلف قسم کے نظام ہائے تعلیم کے مقاصد اور ان کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے باوجود اس بات پر کوئی تحقیقی کام نہیں کر سکے کہ صحیح مقصد تعلیم' جو صحیح قسم کے نظام تعلیم کو پیدا کرتا ہو' کیا ہے۔ اور کس طرح سے جانچا یا پرکھا جا سکتا ہے کہ واقعی صحیح ہے اور اس کا علمی اور عقلی محک و معیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تحقیقی کام ایسے حقائق کو سامنے لاتا ہے جو ان کے لادینی نقطہ نظر کے منافی ہیں اور جن کا سامنا کرنے سے ان کو اس لئے بھی گریز ہے کہ وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تحقیق کرنے والے کا خود اپنا قومی نظام تعلیم غلط مقصدِ تعلیم اور غلط مقصدِ حیات پر مبنی ہے اور لہٰذا غلط ہے۔ یہ بات کہنے کے بعد تحقیق کرنے والا اپنی قوم کا پسندیدہ اور ہر دلعزیز فرد نہیں رہ سکتا۔ اور کی مثال میں [illegible] کو خود کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کی تعلیم غلط ہے' بلکہ [illegible]

کی صحت اور معقولیت اور ضرورت کے حق میں دلائل مہیا کرے گا۔ تاہم جو معلم افراد کی صحیح تعلیم کا اہتمام کرنا چاہتا ہے اس کے لئے حد درجہ ضروری ہے کہ وہ اپنا کام شروع کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ صحیح مقصد تعلیم کیا ہے۔

آج تمام حکمائے تعلیم اپنے مشاہدات اور تجربات کی بنا پر اس حقیقت پر متفق ہیں کہ تعلیم انسان کی اندرونی اور قدرتی نشوونما کا ایک عمل ہے جو خود بخود اپنے مراحل طے کرتا جاتا ہے بشرطیکہ گردوپیش کے حالات اس نشوونما کے ممد و معاون ہوں' مزاحم اور مخالف نہ ہوں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک حیوان یا پودے کی نشوونما۔ جب ایک پودا یا حیوان نشوونما پاتا ہے تو کوئی چیز باہر سے اس پر تھوپی نہیں جاتی بلکہ جو صلاحیتیں اس کے اندر بالقوۃ موجود ہوتی ہیں وہی نشوونما پانے سے بالفعل آشکار اور نمودار ہوتی چلی جاتی ہیں' بشرطیکہ بیرونی حالات مثلاً ہوا' پانی' روشنی اور خوراک اس پودے یا حیوان کی نشوونما کے لئے سازگار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ صحیح طریق تعلیم یہ ہے کہ بچے کی اندرونی قدرتی نشوونما کے عمل میں کوئی مداخلت نہ کی جائے اور اس کو خود اپنی راہ پانے کے لئے آزاد رہنے دیا جائے۔ معلم کا کام صرف اتنا ہو کہ وہ بچے کے اردگرد ایسے حالات پیدا کر دے جو اس کی نشوونما کے اندرونی مخفی تقاضوں سے پوری پوری موافقت رکھتے ہوں اور ایسے حالات کو بچے کے ماحول سے باز رکھے جو ان تقاضوں کے منافی ہوں۔

عمل تعلیم کی اس بنیادی' عظیم الشان اور مسلّمہ حقیقت سے کئی قیمتی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً اس سے ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ انسان کے پاس اس کے جسم کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ایسی ہے جو نشوونما پا سکتی ہے اور پاتی ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ تعلیم جسم کی نشوونما کا نام نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ناتعلیم یافتہ آدمی کا جسم پوری طرح سے نشوونما پایا ہوا ہو اور ایک عمدہ اور اعلیٰ تعلیم کے آدمی کا جسم نحیف و نزار ہو۔ اگر انسان کا جسم ہوا' پانی' روشنی اور غذا سے نشوونما پاتا ہے تو نشوونما پانے والی یہ دوسری چیز تعلیم سے نشوونما پاتی ہے۔ لہٰذا ماہر تعلیم کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ وجود انسانی کے اندر یہ دوسری چیز جس کی نشوونما کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے کون سی ہے اور کیسی ہے' اس کے اوصاف و

خواص کیا ہیں، اس کے تقاضے کیا ہیں، اس کی ضرورتیں کیا ہیں، کونسی چیزیں اس کی نشوونما کے لئے ممد و معاون ہیں اور کونسی مضر اور مخالف۔ جب تک ماہر تعلیم اس چیز کی ضروریات کو نہ جانے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تعلیم سے بالیدگی اور نشوونما پانے والی یہ دوسری چیز وہی ہے، جسے فلسفہ کی اصطلاح میں شخصیت اور مذہب کی اصطلاح میں روح کہا جاتا ہے۔

شیخِ مکتب ہے اِک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روحِ انسانی

دوسرا نتیجہ اس عظیم الشان عملی حقیقت سے یہ نکلتا ہے کہ جس طرح سے آم کی ایک گٹھلی کی نشوونما کا یہ صحیح مقصد کہ اسے نشوونما پاکر ایک خاص قسم کا درخت بننا چاہئے، جس کی چھال، پھل پھول، پتے اور ٹہنیاں خاص قسم کی ہوں، گٹھلی کی فطرت کے اندر ہی پوشیدہ ہے۔ اسی طرح سے شخصیت انسانی کی نشوونما کا صحیح مقصد جو اس کی صحیح اور کامل نشوونما کا ضامن ہے اس کی فطرت کے اندر ہی پوشیدہ ہے اور ہم (جیسا کہ ڈیوی اور اس کے ہم خیال مغربی حکمائے تعلیم نے غلطی سے سمجھا ہے) اسے انسان کے خارجی حالات و واقعات اور بیرونی ضروریات میں تلاش نہیں کر سکتے۔ ان حالات و واقعات اور ضروریات کے خلاف انسان کا صحیح رد عمل وہی ہونا چاہئے جو انسانی شخصیت کے صحیح اندرونی فطرتی مقصد تعلیم کے مطابق نشوونما پائی ہوئی ایک انسانی شخصیت سے سرزد ہوتا ہے۔ اگر انسانی شخصیت کی نشوونما اس کے اندرونی فطری مقصدِ تعلیم کے مطابق ہوئی ہو تو انسانی شخصیت آزادانہ اور مکمل طور پر نشوونما پاتی ہے اور نشوونما پاکر خود بخود نظریاتی، علمیاتی، اخلاقیاتی اور جمالیاتی خصوصیتوں کے ایسے پھل پھول، پتے اور ٹہنیاں پیدا کر لیتی ہے جو خالصتاً انسانی قسم کے ہوں اور مقام انسانی کے شایان شان ہوں۔

تیسرا نتیجہ اس حقیقت سے یہ نکلتا ہے کہ روح انسانی یا شخصیت انسانی کو اپنی نشوونما کے لئے کسی غذا کی ضرورت ہے، کیونکہ نشوونما بغیر غذا کے تصور میں نہیں آسکتی۔ وہ غذا کونسی ہے جو روح کی پرورش یا دوسرے لفظوں میں انسان کی تعلیمی نشوونما کا باعث ہوتی

ہے۔ اس سوال کا معقول جواب جس کی طرف صحیح علمی و عقلی استدلال راہنمائی کرتا ہے یہ ہے کہ روح کی غذا حسن ہے۔ جس طرح جسم کو غذا کی اشتہا ہوتی ہے اسی طرح روح کو حسن کی اشتہا ہوتی ہے اور جس طرح جسم غذا سے لذت اندوز ہوتا ہے اور تازگی اور شگفتگی حاصل کرتا ہے اسی طرح روح حسن سے لذت اندوز ہوتی' اطمینان پاتی اور سرور حاصل کرتی ہے۔ پھر جس طرح جسم کے اندر غذا کو جذب کرنے اور جذب کر کے قوی اور توانا ہونے کی صلاحیت ہے اسی طرح روح انسانی میں حسن کو جذب کرنے اور جذب کر کے اخلاقی' علمی' روحانی اور جمالیاتی طور پر قوی اور توانا ہونے کی صلاحیت ہے۔ جس طرح جسم کی اشتہا کو مطمئن کرنے کے لئے انسان ایسی خوراک کی جستجو کرتا ہے جو پاک اور صاف اور لذیذ اور صحت بخش ہو اور جس کے اندر پروٹین اور حیاتین اور فلزات کے تمام ضروری عناصر موجود ہوں اسی طرح حسن کی اشتہا کو مطمئن کرنے کے لئے انسان ایک ایسے تصور کی جستجو کرتا ہے جو نہایت ہی حسین اور جمیل ہو' جس سے زیادہ حسین اور جمیل تصور اور کوئی نہ ہو' جو ہر نقص اور کمی سے مبرا ہو اور جس کے اندر بلا استثناء تمام صفاتِ حسن و کمال بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ صرف ایسا تصور ہی انسان کی اشتہائے حسن کو پوری طرح سے مطمئن کر سکتا ہے۔ لفظ خدا کی تعریف ہی سے ظاہر ہے کہ ایسا تصور سوائے خدا کے تصور کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو ذات تمام نقائص سے مبرا اور تمام صفاتِ حسن و کمال سے متصف ہو اسی کو خدا کہا جاتا ہے' لہٰذا انسان فطرتاً خدا اور اس کی صفاتِ حسن کی اشتہا یا آرزو رکھتا ہے اور اس آرزو کو مطمئن کرنے اور حسن کو اپنی شخصیت کے اندر جذب کرنے کے لئے حسن کی ستائش کرتا ہے اور اس غرض کے لئے ہر مفید اور کارآمد طریق جس کی راہنمائی پاتا ہے' اختیار کرتا ہے۔ مثلاً خدا کی صفات حسن پر توجہ مرکوز کر کے حسن کے باطنی مشاہدہ سے لذت اندوز ہونے کے لئے ان الفاظ کو بار بار دہراتا ہے جو ان صفات پر دلالت کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ اور حسن سے انتہائی قرب حاصل کرنے اور ہر ایسی خواہش سے چھٹکارا پانے کے لئے جو اس قرب میں حائل ہونے والی ہو وہ قیام اور رکوع اور سجود اور قعود کے ذریعہ سے حسن کے سامنے عاجزی اور انکساری اور تضرع اور ابتہال اور گریہ زاری کرتا ہے۔ آرزوئے حسن کو مطمئن کرنے کا

یہ طریق جس کی ایک صورت نماز بھی ہے ذکر کہلاتا ہے۔ پھر وہ علمی صداقتوں اور حقیقتوں میں خدا کی صفتِ حق کی جھلک دیکھ کر ان کی جستجو کے درپے ہوتا ہے۔ طلب حسن کے اس طریق کو جستجوئے صداقت یا جستجوئے علم کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر وہ خدا کی تخلیق میں خدا کی صفاتِ حسن کے نشانات کی جستجو کرنے کے لئے مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتا ہے۔ آرزوئے حسن کو مطمئن کرنے کا یہ طریق جسے تفکر یا زیادہ تفصیل کے ساتھ "تفکر فی الخلق" کہا جاتا ہے، طلبِ حسن ہی کا ایک پہلو ہے، جس کی بدولت مسلمانوں نے سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی۔ پھر وہ اپنے ان اعمال و افعال میں جو اپنے آپ کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ اس کے برتاؤ سے تعلق رکھتے ہیں باطنی اور معنوی حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، یعنی ان کو بمصداق "تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ" خدا کی صفات حسن کے مطابق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرزوئے حسن کو مطمئن کرنے کے اس طریق کو حسن اخلاق یا نیکی کی جستجو کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر وہ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، اوڑھنے پہننے، رہنے سہنے، کھانے پینے، بات چیت کرنے، کھیلنے، سفر کرنے اور دوسروں سے میل ملاقات کرنے اور ان کے علاوہ اپنے دوسرے کاموں کے طور طریقوں میں ظاہری حسن اور صفائی اور عمدگی اور زیبائی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، بحکم "اللّٰہ جمیلٌ ویحب الجمال"۔ آرزوئے حسن کی تشفی کے اس طریق کو جس کا مقصد ماحولِ زندگی میں تخلیقِ حسن ہے جمالیاتی فعلیت (Aesthetic Activity) کہا جاتا ہے۔ حسن کی آرزو کو مطمئن کرنے کے یہ چاروں طریقے، یعنی عبادت یا ستائش حسن، تحصیل علم یا جستجوئے حسن، نیکی یا حسن خلق اور جمالیاتی عمل یا حسن ذوق شخصیت انسانی کی تکمیل اور تجمیل کا یا دوسرے لفظوں میں اس کی بالیدگی اور نشوونما کا موجب ہوتے ہیں۔

چوتھا نتیجہ اس حقیقت سے یہ نکلتا ہے کہ چونکہ تعلیم ایک اندرونی اور قدرتی عمل ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ قدرت نے اس کو کلیۃً انسان پر چھوڑ دیا ہو، بلکہ ضروری ہے کہ اس نے اس کے بنیادی لوازمات کا اہتمام خود کیا ہو۔ قدرت کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی ہر ضرورت کا بنیادی اور ضروری اہتمام خود کرتی ہے اور پھر یہ اہتمام اس قسم کا

ہوتا ہے کہ اس کو نظرانداز کر کے یا اس سے پہلو تہی کر کے اس ضرورت کو بتمام و کمال پورا کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک حیوان کی بدنی نشوونما ایک قدرتی عمل ہے۔ قدرت اس کا بنیادی اہتمام دو طرح سے کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے حیوان کے جسم کے اندر غذا جذب کرنے اور غذا کو جذب کر کے نشوونما پانے کی اندرونی صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں اور دوسرے یہ کہ اس نے حیوان کے جسم کے باہر ہوا اور غذا اور پانی اور روشنی ایسی چیزیں مہیا کی ہیں جن کے بغیر اس کی یہ اندرونی صلاحیتیں بے کار ہوتیں' کیونکہ ان کا مہیا کرنا حیوان کے بس کی بات نہ تھی۔ بالکل اسی طرح سے روح انسانی کی نشوونما ایک قدرتی عمل ہے اور قدرت نے اس نشوونما کا بنیادی اہتمام دو طرح کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے شخصیتِ انسانی سے باہر پے در پے آنے والے معلموں کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے جن کو انبیاء کہا جاتا ہے اور پھر اس سلسلہ کو اس نے ایک معلّمِ کامل (ﷺ) پر ختم کیا ہے جو نہ صرف اپنی زبانی تلقین اور ہدایت سے بلکہ اپنی عملی زندگی کے نمونہ سے بھی انبیاء کی تعلیم کو کمال پر پہنچاتے ہیں۔ خاتم النبیّن کے ظہور کے بغیر نہ تو خدا کا تصور ہی ان غلطیوں اور شرک کی آلائشوں سے پاک و صاف ہو سکتا تھا جو اس میں داخل ہو گئی تھیں اور نہ ہی خدا کے پاک اور صاف عقیدہ کے مطابق عملی زندگی بسر کرنے کا کوئی ایسا نمونہ ہی سامنے آ سکتا تھا جس میں خدا کا پاک و صاف عقیدہ انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر چسپاں کیا ہوا نظر آتا۔ نظری اور عملی طور پر خدا کے عقیدہ کے معنی کیا ہیں۔ اس سوال کا مکمل جواب ہمیں صرف خاتم النبیّن ﷺ کی تعلیمات ہی سے مل سکتا ہے۔

مختصر طور پر صحیح تعلیم کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کا ہر عنصر خدا کے عقیدہ پر مبنی ہو۔ خدا کا عقیدہ ہی اس کے عملی' اخلاقی' سائنٹی اور جمالیاتی پہلوؤں کی بنیاد ہو۔ تعلیم کا جو پہلو بھی خدا کے عقیدہ کے بغیر رہے گا وہ روح انسانی کے لئے جذبِ حسن کا اہتمام نہیں کر سکے گا اور لہٰذا فرد کی تعلیمی نشوونما کے لئے بے کار ہو گا۔ چونکہ سارے حسن کا منبع خدا ہے اور علم اور اخلاق اور عبادت اور جمالیاتی عمل کا مقصد حسن کی جستجو ہے' لہٰذا ظاہر ہے کہ انسان کی علمی' اخلاقی' جمالیاتی اور سائنٹی فعلیت اپنے مقصد کو اس وقت پائے گی اور اپنے کمال کو اس وقت پہنچے گی جب اس کا مطلوب اور مقصود اور اس کا مدار اور محور خدا

ہو گا۔ ہمارے علمی' اخلاقی' ستائشی اور جمالیاتی اعمال جس قدر خدا کے تصور سے ہٹے ہوئے ہوں گے وہ اسی قدر غلط اور ناقص ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ معلّمِ کامل ﷺ کی تعلیمات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہمارے تمام ستائشی' اخلاقی' علمی اور جمالیاتی اعمال و افعال کا مقصود خدا ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے عقیدہ سے ہٹ کر اگر کوئی تعلیم ممکن ہے تو وہ کم و بیش ایسی ہو سکتی ہے جیسی کہ اوپر کی مثال میں راہزن کے بیٹے کی تعلیم۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ بے خدا تعلیم کی بعض قسمیں بڑے آشکار راہزن پیدا کرتی ہیں اور بعض قسمیں چھوٹے اور مخفی راہزن۔

جسم کی اشتہائے غذا کی طرح روح کی اشتہائے حسن بھی پوری طرح سے دبائی نہیں جا سکتی۔ اگر انسان کو اچھی' لذیذ اور صحت بخش غذا نہ مل سکے تو پھر جو غذا بھی اسے مل جائے وہ اسی سے اپنا پیٹ بھرتا ہے اور اسی میں لذت محسوس کرتا ہے' خواہ اس کی صحت ٹھیک رہے یا نہ رہے۔ اسی طرح سے جب انسان اپنی لاعلمی یا اپنے تعصب کی وجہ سے خدا کے تصور سے پوری طرح آشنا نہ ہو اور خدا کی صفات کے حسن و کمال کا ذاتی احساس نہ کر سکے تو وہ اپنی اشتہائے حسن کی تشفی کے لئے کسی غلط اور ناقص تصور کی طرف لاشعوری طور پر خدا کی صفاتِ حسن کو منسوب کرنے لگتا ہے۔ اور اسی کو اپنی مشتاقِ جمال فطرت سے مجبور ہو کر اس طرح سے چاہنے لگتا ہے کہ گویا وہ سچ مچ کا خدا ہے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے تو وہ پھر تمام علمی یا سائنسی حقائق جو اس کے دائرۂ علم میں داخل ہوتے ہیں اور اس کے تمام قدرتی' اخلاقی اور جمالیاتی اور ستائشی اعمال و افعال جو اس سے سرزد ہوتے ہیں اس کے اس تصورِ حسن میں ڈوب کر اور اس کے رنگ سے رنگین ہو کر باہر آتے ہیں اور اس عمل کے دوران میں اپنی قدرتی حالت سے بدل کر اس کے مطابق ہو جاتے ہیں اور لہٰذا اتنے ہی غلط اور ناقص ہو جاتے ہیں جتنا کہ اس کا یہ تصور حسن غلط یا ناقص ہوتا ہے۔ اس کے علمی حقائق اس کے تصور حسن کے ساتھ مل کر ایک تنظیم بناتے ہیں اور اس کے اردگرد جمع ہو کر اس طرح موجود رہتے ہیں جیسے کہ مقناطیس کے اردگرد لوہا چون کے اجزاء۔

دورِ حاضر کے غلط اور ناقص تصورات حسن جو اس طرح سے خدا کی جگہ لیتے ہیں

حسب ذیل ہیں : انگریزی قومیت، فرانسیسی قومیت، اطالوی قومیت، جرمن نسلیت، یہودی نسلیت، عربی نسلیت، روسی اشتراکیت، امریکی جمہوریت وغیرہ۔ یہی آج کل قوموں کے مقاصد حیات ہیں اور یہی ان کے مقاصد تعلیم۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اصل مقصدِ حیات اور مقصدِ تعلیم جو انسان کی فطرت سے پیدا ہوتا ہے، کہیں بھی نہیں۔ اس وقت عالم انسانی میں کوئی بھی نظام تعلیم ایسا نہیں جو تعلیم کو ایک اندرونی نشوونما کے عمل کی حیثیت سے اپنا صحیح اور قدرتی راستہ اختیار کرنے کے لئے آزاد چھوڑتا ہو، بلکہ جس طرح سے آم کا نوخیز پودا ایک طرف دباؤ پڑنے سے اگنے کے باوجود ٹیڑھا ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھک کر زمین سے لگ جاتا ہے، اسی طرح سے اس وقت دنیا کے ہر نظام تعلیم کے اندر کسی نہ کسی غلط اور ناقص مقصد حیات اور مقصد تعلیم کا دباؤ نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کی شخصیتوں کو ٹیڑھا کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب ٹیڑھی اور غیر قدرتی نشوونما پانے والی شخصیتوں نے عالمِ انسانی کو بھر دیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ لاکھوں افراد ذہنی بیماریوں کا شکار ہو کر دنیا کے دماغی ہسپتالوں کو بھر رہے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ طفولیتی بے راہ روی (deliquency) کی حدود ہر روز پھیلتی جا رہی ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ خودکشیوں، ڈکیتیوں، قتلوں اور دوسرے جرموں کے اعداد و شمار بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ امریکہ کی مخلوط یونیورسٹیوں میں آزادانہ جنسی میل جول کی شرمناک تحریکیں ارباب اختیار کی چشم پوشی سے ہی نہیں بلکہ سرپرستی میں کھلم کھلا منظم کی جا رہی ہیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس وقت عالم انسانی ہر لحہ ایک عالمگیر جنگ کی تباہ کاریوں کا خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اقتصادی خوشحالی کے باوجود مہذب اور ترقی یافتہ لوگوں کے دل بے قرار اور زندگی سے بے زار ہیں۔ اس وقت نوع انسانی کی سب سے بڑی بدبختی ایٹم بموں اور میزائلوں کے جابجا پھیلے ہوئے انبار نہیں بلکہ غلط اور بے خدا تعلیم کی عالمگیری ہے جس سے انسان کی اور تمام بدبختیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

افسوس ہے کہ اس وقت ہمارا پاکستانی نظام تعلیم بھی، جس کو ہم نے اسلامیات کا ایک مضمون شامل کر کے صحیح بنانے کی کوشش کی ہے، مغرب کے بے خدا اور غلط نظام ہائے تعلیم کی ایک بھونڈی نقل ہے۔ اسلامیات کا مضمون شامل کرنے سے اس کے اساسی

لادینی مقصدِ حیات اور مقصدِ تعلیم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ البتہ پاکستانی طالب علم کے ذہن میں یہ بات اور واضح ہو گئی ہے کہ یونیورسٹی کے اصل علوم کے ساتھ جو پورے نصاب پچانوے فیصد حصہ ہیں' اسلام یا اسلامیات کا کوئی تعلق نہیں۔ گویا اس وقت پاکستانی نظام تعلیم دو نظریات تعلیم کے زیر اثر ہے۔ ایک صحیح اور باخدا نظریۂ تعلیم جو اسلامیات کے مضمون کی حد تک کام کرتا ہے اور دوسرا غلط اور لادینی نظریۂ تعلیم جو باقی ماندہ پورے نظام تعلیم پر چھایا ہوا ہے۔ لیکن حق و باطل کا امتزاج باطل ہی بن جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ اقبال نے اسی آیت کا ایک شعر میں ترجمہ کیا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

بڑی مدت کے بعد اہلِ مکّہ نے یہ بات سمجھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ بتوں کی عبادت گوارا کیوں نہیں کر سکتے۔ حق و باطل اور نور و ظلمت بہم نہیں ہو سکتے۔

اگر نوع انسانی نے زندہ رہنا ہے اور پھر اگر اس نے امن و اتحاد کی نعمتوں سے ہمکنار ہونا ہے' اگر اس نے اپنی علمی' اخلاقی' جمالیاتی' روحانی اور مادی ترقیوں کی اس انتہا تک پہنچنا ہے جو اس کی فطرت کی صلاحیتوں کے اندر اس کے لئے مقدر ہو چکی ہے تو اس بے خدا اور غلط تعلیم کا طلسم ٹوٹنا چاہئے۔ لیکن مغرب جو اس طلسم کا خالق ہے اس کو توڑ نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کے حکمائے تعلیم خدا کے عقیدہ کے خلاف ایک شدید قسم کے علمی تعصب میں مبتلا ہیں۔ اسی تعصب کی وجہ سے وہ خدا کے عقیدہ کو دنیوی اور عقلی علوم کے منافی سمجھتے ہیں اور ان کا یہ دستور بن گیا ہے کہ جب بھی ان کا علمی اور عقلی استدلال خود بخود اور بے ساختہ خدا کے تصور کی طرف جانے لگتا ہے وہ بتکلف اس کو گھما پھرا کر واپس لاتے ہیں' خواہ ان کا استدلال مضحکہ خیز کیوں نہ بن جائے۔ اسی تعصب کی وجہ سے مغرب کے حکمائے تعلیم اپنی ہی دریافت کی ہوئی اس عظیم الشان علمی حقیقت سے کہ تعلیم قدرتی نشوونما کا ایک عمل ہے' اوپر بیان کئے ہوئے نتائج کو جو ظاہر اور باہر ہیں' اخذ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مغرب کا ہر فلسفہ'

تعلیم پراگندہ خیالات کا ایک مجموعہ اور علمی اور عقلی اور منطقی استدلال کی سنگین غلطیوں کا ایک سلسلہ ہے۔

پاکستانی نظام تعلیم کی موجودہ حالت کے باوجود اگر یہ طلسم کسی خطۂ ارض میں ٹوٹ سکتا ہے تو وہ پاکستان ہے، کیونکہ فقط پاکستانی قوم ہی کا نظریۂ حیات یعنی اسلام وہ روشنی بخشتا ہے جو اس بے خدا تعلیم کی علمی خامیوں اور عملی تباہ کاریوں کو آشکار کر سکتی ہے اور صحیح باخدا محافظ و معاون انسانیت نظام تعلیم کو وجود میں لا سکتی ہے۔ مسلمان ممالک اور بھی ہیں لیکن اس دور میں صرف پاکستانی قوم ہی ایک ایسی قوم ہے جس نے بے شمار قربانیاں دے کر فقط اس لئے آزادی حاصل کی ہے کہ وہ اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں بلکہ کائنات کی آخری منزل کی طرف حرکتِ ارتقاء کا ایک ضروری قدم ہے جس کا وقت پہنچ گیا تھا۔ قرآن حکیم نے ہمیں بتایا ہے کہ خدا کا قانون ہے کہ جب باطل قوت پکڑتا ہے تو ہم حق کو اس کے مقابل پر کھڑا کر دیتے ہیں کہ اس کا سر کچل دے اور اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ اب بتایئے کہ کیا ابتدائے تاریخ سے لے کر آج تک باطل کبھی اتنا طاقتور ہوا تھا جتنا کہ آج ہے۔ لادینیت پسندوں اور دہریت پرستوں کی بڑی بڑی سلطنتوں سے پوری دنیا بھری ہوئی ہے، جن کی اقتصادی اور فوجی قوت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اگر خدا کا قانون سچا ہے تو اور کونسا وقت ہے جب حق باطل کے مقابل پر آنے کے لئے ابھرے گا۔ یقیناً پاکستان کا قیام باطل کے مقابل میں حق کا پہلا ظہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ جنگ (ستمبر۱۹۶۵ء) میں پانچ گنا طاقت سے حملہ کرنے والا دشمن اپنی پوری کوششوں کے باوجود پاکستان کی اتنی لمبی سرحد پر کہیں بھی پاکستان کی ڈیفنس لائن میں دراڑ پیدا نہیں کر سکا۔ واقعات بتا رہے ہیں کہ پاکستان اس لئے وجود میں آیا ہے کہ صحیح باخدا نظام تعلیم یہاں سے ابھرے اور غلط اور بے خدا تعلیم کو ہر جگہ سے ملیامیٹ کرتا ہوا دنیا بھر میں پھیل جائے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ظہور دورِ حاضر کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے، لیکن دور حاضر کی تاریخ کا اس سے بھی بڑا واقعہ یہ ہو گا کہ پاکستان کے اندر ایک جدید اسلامی یونیورسٹی کی صورت میں صحیح اور باخدا نظام تعلیم کا ایک نمونہ یا ماڈل ظہور پذیر ہو

جو اپنی معقولیت اور افادیت کی وجہ سے پہلے پورے پاکستان میں اور پھر پوری دنیا میں نقل کیا جائے۔ جو لوگ اس ماڈل کی تخلیق اور تکمیل میں اعانت کریں گے "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ" کے مصداق خدا کی حیرت انگیز اعانت ان کے ساتھ ہو گی۔

اقتصادی وسائل اور تباہ کن آلاتِ حرب و ضرب سے دوسری قوموں پر غالب آنے کا دور گزر چکا ہے۔ اب نظریات اور تصورات کا زمانہ ہے۔ اب وہی قوم دنیا میں غالب رہے گی جس کے پاس دلوں کو مسخر کرنے والے افکار و تصورات ہوں۔ تمام دوسری قوموں کے اقتصادی وسائل اور آلاتِ حرب و ضرب اسی قوم کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی کے کام آئیں گے۔ اس قسم کے تمام افکار و تصورات کا سرچشمہ توحید کا عقیدہ ہے اور جب سائنسی علوم یعنی طبیعیاتی' جمالیاتی اور انسانی علوم کو موحّد بنالیا جائے اور خدا کے عقیدہ کو ان کی ابتدا اور انتہا قرار دے دیا جائے تو پھر یہ تمام افکار و تصورات اس سرچشمہ سے بہہ نکلتے ہیں اور ان کے اندر ایک ایسی تنظیم اور ہم آہنگی اور معقولیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ منکرین توحید کے دلوں کو بھی متاثر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا جب اس نے کہا تھا ؎

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے!

اگر مسلمان قوم کا یہ رول پاکستان کے ذریعہ سے اس طرح ادا ہونے والا ہے کہ پاکستان میں ہی صحیح اور باخدا نظام تعلیم کا وہ نمونہ پیدا ہو گا جو رفتہ رفتہ تمام دنیا میں اپنالیا جائے گا تو آیئے آج سے ہم مل کر اس نمونہ کو پیدا کرنے کی کوشش کریں تا کہ اسلام کی آخری عالمگیر نشر و اشاعت کی ابتداء کرنے کی سعادت ہمارے حصہ میں آئے۔

تہذیب الاطفال

(آخری قسط)

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

سات سال سے بلوغت تک

بچہ جب سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز کی تلقین کریں اور نماز پڑھائیں۔ کوشش کریں کہ سات سال سے پہلے پہلے بچے کو نماز پڑھنا اور وضو وغیرہ کرنا سکھا دیں تا کہ ایک دم سے بچہ زیادہ بوجھ محسوس نہ کرے۔ حدیث مبارکہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

مُرُوا اَوْلَادَ کُمْ بِالصَّلٰوۃِ وَھُمْ اَبْنَاءُ سَبْعٍ وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَھُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَیْنَھُمْ فِی الْمَضَاجِعِ

"اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کے ہو جائیں اور دس سال کی عمر میں (اگر وہ نماز نہ پڑھیں) ان کو مارو اور ان کے بستر الگ کر دو۔"

غور طلب بات ہے کہ ہم اپنے بچوں کو عام طور پر تین سال کی عمر میں ہی سکول داخل کروا دیتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو بچہ اٹھنا بیٹھنا اور کچھ تمیز اور تہذیب ہی سیکھ لے گا' جبکہ اللہ تعالیٰ نے دین کی بنیاد یعنی نماز کا باقاعدہ اہتمام سات سال کی عمر سے کروایا ہے۔ آخر اس میں کیا حکمت ہے؟ یہ کہ ماں سات سال کی عمر تک اپنے بچے کو ذہنی طور پر تیار کرتی ہے اور اخلاقی طور پر اچھی تربیت کر کے اس کے شعور کو صحیح رخ پر پروان چڑھاتی ہے---- تا کہ ماں کو صحیح رخ پر دیکھ کر بچہ بھی خدائے وحدہٗ لاشریک کے آگے سجدہ ریز ہو۔ اور خود بخود خدا کی عظمت آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ میں اجاگر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ اچھے ماحول کا اثر ہوتا ہے جو کہ لامحالہ بچوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بچہ ہر طرف سے بے خوف ہو کر ایک خدا سے ڈرتا ہے بشرطیکہ اس کو یکسو کیا جائے اور اس معصوم کے دماغ کی سوئیوں کو کسی اور طرف حرکت نہ دی جائے' اسے پیروں فقیروں سے مانگنا نہ سکھایا جائے' غلط

معاشرے کی بندگی کرنا نہ سکھائی جائے' روپے پیسے کا بندہ نہ بنایا جائے' اپنے آباء واجداد کی روایات کی اندھادھند تقلید نہ کروائی جائے' غرض یہ کہ ان تمام خداؤں سے بچا کر ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کی پوجا اور پرستش کروائی جائے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

تو بچہ بڑے ہوتے ہوتے اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّین کے مفہوم سے صحیح طور پر آگاہ ہوتا ہے اور پانچ دفعہ نماز باجماعت سے نظم وضبط کا جو شعور اس میں پروان چڑھتا ہے' بڑے ہوتے ہوتے اس شعور میں پختگی آجاتی ہے اور یہی نظم وضبط جماعت اقامت دین کا نچوڑ ہے۔ صراط مستقیم کی شاہراہ پہ گامزن ہونے کا راستہ یہی نماز کی بروقت اور پنج وقت ادائیگی ہے۔ ہم جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" کی استعانت طلب کرتے ہیں۔ اور درحقیقت اللہ تعالیٰ صراط مستقیم پر گامزن ضرور کرتا ہے اگر اس کے احکامات پر عمل کرنا شروع کر دیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ آپ خود باشعور ہیں لہٰذا خود دین پر عمل پیرا ہوں اور خدا تعالیٰ کی ان امانتوں یعنی بچوں کو شروع ہی سے نماز پابندی سے پڑھنا سکھائیں اور باقی اخلاقیات پر عمل بھی کروائیں۔

آپ دیکھیں مذکورہ بالا حدیث میں آگے کیا فرمایا جا رہا ہے کہ ۱۰سال کی عمر میں اگر بچہ نماز نہ پڑھے یعنی سستی کرے تو اب اس سے نرمی نہ کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی محبت آڑے آجائے اور آپ انہیں سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے بچانے کے لئے اور گرمیوں میں نیند کی کمی کی وجہ سے نماز کے لئے نہ اٹھائیں اور ان کے آرام کا زیادہ خیال کریں۔ اور اس طرح نہ صرف ان کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ بھی دشمنی کا معاملہ کریں' بلکہ اس کے برعکس معاملہ کریں کہ خود بھی محتاط ہوں اور بچے کی سستی یا نماز سے غفلت برتنے کی وجہ سے ان کی پٹائی بھی کریں۔ ویسے تو ہمیں نبی اکرم ﷺ نے بچوں کے حق میں نرم دل اور رحم دل ہوتے اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے' لیکن یہاں معاملہ دین کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا ہے' نسلِ نو کو دینی نظم کے خوگر بنانے کا ہے' لہٰذا یہاں

سختی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ بچوں کی بنیادوں میں دینی بنیادیں بھی مضبوطی سے قدم جمائیں، جیساکہ حدیث میں ہے کہ "اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّین "کہ نماز دین کا ستون ہے۔ اگر آپ دنیا میں ان کے ساتھ نماز اور دوسرے دینی معاملات میں سختی کرلیں گی تو آخرت میں شدید ترین آگ کے عذاب سے نہ صرف خود بھی بچ جائیں گی بلکہ بچوں کے حق میں بھی بہتر ہوگا کہ وہ قبر کے عذاب سے اور روزِ قیامت کی رسوائی و ذلت سے بچ جائیں گے۔ لہٰذا پیار سے 'ڈانٹ سے 'مار پیٹ سے 'غرض ہر وہ حربہ استعمال کریں کہ آپ کا بچہ نمازی بن جائے۔ آپ کا طرز عمل ان کے ساتھ ایسا ہو کہ ان پر یہ چیز واضح ہو جائے کہ نماز سے غفلت یا سستی آپ ہرگز برداشت نہیں کریں گی۔ اس ضمن میں قرآن حکیم کا حکم یہ ہے کہ وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا "اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس کے پابند رہو"۔

بڑے ہوتے ہوئے بچے کو نماز کے ساتھ ساتھ قرآن کی ناظرہ تعلیم دلوائیں، حافظِ قرآن بنائیں، قرآن کا عالم اور عامل بنائیں۔ اسے دنیاوی تعلیم بھی ضرور دیں، لیکن یہ تمام چیزیں بھی اپنے اوپر بچے کا فرض سمجھیں، اس لئے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو کہ آپ کے پاس عمل کرنے کے لئے ہے اور بچے آپ کے پاس اللہ کی امانت ہیں تا کہ آپ انہیں اللہ کی کتاب پر عمل کرنا سکھائیں۔ اور خود ہم بھی تو اللہ ہی کے ہیں۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم سب اللہ کے ہیں، اسی کی مخلوق ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹنا ہے۔ تو جب ہم سب کو اسی کی طرف جانا ہے اور ہمارا یہی یقین کامل ہے تو کیوں نہ اپنے بچوں پر آج سے ہی توجہ دینی شروع کردیں۔

شادی کا مرحلہ

والدین کی ذمہ داریوں کا آخری مرحلہ بچوں کی شادی کرنے کا ہوتا ہے۔ شادی تک بچے والدین کی سرپرستی میں ہوتے ہیں اور وہ اللہ کے ہاں ان کے بارے میں جواب دہ ہیں۔ اس کے بعد بچے خود اپنے ذمہ دار ہیں، کیونکہ اس وقت تک وہ باشعور ہو چکے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں والدین پر آخری فرض شادی کا رہ جاتا ہے۔ اس کے بارے میں

بھی ہم نبی اکرم ﷺ سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ نکاح کے لئے عام طور پر عورت میں چار چیزیں دیکھی جاتی ہیں : مال و دولت' خاندانی شرافت' حسن و جمال اور دین و اخلاق۔ تم دیندار عورت سے شادی کرو' تمہارا بھلا ہو! اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھولاتے وقت اولین اہمیت دین و اخلاق کو دینی چاہئے' اگر باقی تین چیزیں لڑکی میں موجود نہیں ہیں اور صرف دین و اخلاق ہے تو تم صرف اسی کو اہمیت دو اور شادی کر دو۔ اگر دین و اخلاق نہیں ہے اور باقی چیزیں پوری موجود ہیں تو تم وہاں شادی نہ کرو' خواہ دنیوی فائدہ کتنا ہی کیوں نہ نظر آئے۔ یہ ہے نبی اکرم ﷺ کی تعلیم۔ اس لئے کہ اگر باقی چیزیں موجود نہ ہوں اور دین و اخلاق اچھا ہو تو آئندہ نسل اچھی اٹھے گی اور ایک اچھا معاشرہ تشکیل پائے گا اور یہی مقصود و مطلوب ہونا چاہئے۔ لیکن دین و اخلاق سے محروم لڑکی تو یوں سمجھیں کہ ہر لحاظ سے نقصان دہ ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : "جب تمہارے ہاں کوئی ایسا شخص نکاح کا پیغام بھیجے جس کے دین و اخلاق سے تم مطمئن اور خوش ہو تو اس سے اپنے جگر گوشے کی شادی کر دو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں زبردست فساد ہو گا"۔ اس حدیث مبارکہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نکاح میں مسلمان مرد و عورت کا دین و اخلاق کے لحاظ سے اچھا ہونا ہی ایمان کی علامت ہے اور مسلمان میاں اور بیوی کا با اخلاق ہونا آئندہ زندگی میں بھی اور دین کو آگے بڑھانے میں بھی حد درجہ مفید ہے۔ دیندار زوجین دین کے معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ صالح بیوی اپنے قول و عمل سے صالح مرد کا دست و بازو بنتی ہے۔ دنیا میں یہ اس لحاظ سے بھی نہایت ضروری اور مفید ہے کہ اولاد بہت اچھی اٹھے گی اور صحیح اسلامی طریقے سے پروان چڑھے گی۔ دیکھئے بات پھر وہیں پہنچ گئی ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی اولاد کی اچھی تربیت۔ اور یہ پہیہ ان شاء اللہ اسی طریقے سے چلتا رہے گا۔ لیکن اگر ہم بے مقصد پہیے چلاتے رہیں تو ہمارا اور ہمارے بچوں کا دنیا میں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پھر تو ہماری حیثیت بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اگر میاں بیوی مل کر با مقصد طریقے سے

خود بھی زندگی گزاریں اور بچوں کو بھی دین کی راہ پر لگائیں تاکہ ان کے بچے بھی اسی طرح دیندار بنیں، تبھی ایک اسلامی معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور ہماری نجاتِ اخروی بھی تب ہی ممکن ہے۔

شادی کے ضمن میں ایک بات بہت اہم ہے کہ بلاوجہ شادی کرنے میں تاخیر کرنا شرعی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ اس طرح اولاد کا غلط رخ پر پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، جس کے ذمہ دار والدین ہی ٹھہرتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جائے تو والدین دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی اٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھی گنہگار ہوتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((مَن وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهُ وَأَدَّبَهُ فَإِذَا بَلَغَ فَلْيُزَوِّجْهُ، وَإِنْ بَلَغَ وَلَمْ يُزَوِّجْهُ فَأَصَابَ إِثْمًا فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى أَبِيهِ)) (بیہقی)

"جس شخص کے ہاں بچہ پیدا ہو تو اسے چاہئے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی اچھی تعلیم و تربیت کرے۔ پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے۔ اور اگر بالغ ہونے پر اس کا نکاح نہ کیا اور وہ کسی گناہ میں پڑ گیا تو اس کا وبال اس کے باپ پر ہو گا"۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ باقی تمام معاملات میں عورت کو زیادہ ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ بچوں پر نگران ہے اور وہ اس اعتبار سے اللہ کے ہاں مسئول ہے، لیکن یہاں معاملہ الٹ ہو گیا۔ یہاں عورت کی نسبت مرد کی باز پرس ہو رہی ہے، کیونکہ قانونی طور پر اولاد مرد کی ہے۔ لہٰذا شادی بیاہ جیسے بندھن کو باندھنا مرد ہی کی ذمہ داری ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تورات میں لکھا ہے کہ جس کسی کی بچی بارہ سال کی عمر کو پہنچ گئی اور اس نے اس کا نکاح نہ کیا اور وہ بچی کسی غلط کام میں پڑ گئی تو اس کا گناہ اس کے باپ پر ہو گا۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ چاہے رشتہ اچھا نہ مل رہا ہو یا کچھ اور مجبوریاں آڑے آ رہی ہوں تب بھی ہر حال میں شادی اسی عمر میں کرنی ہے، بلکہ ذہنی طور پر ہمیں تیار رہنا چاہئے کہ جونہی دین و اخلاق کے لحاظ سے

اور معاشی و معاشرتی اعتبار سے اچھا رشتہ مل جائے تو شادی کر دینی ہے۔ اس بات سے زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئے کہ بچی ابھی چھوٹی ہے یا بچہ ابھی چھوٹا ہے۔ والدین کی فطری محبت اور معاشی مسائل وقتاً اس راہ میں حائل ہو سکتے ہیں لیکن یہی فطری محبت اولاد کے حق میں دشمنی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر اولاد بری صحبت میں پڑ جائے اور اس سے کوئی گناہ صادر ہو جائے تب تو "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ" والا معاملہ ہو جائے گا۔

حرفِ آخر

تہذیب الاطفال یعنی بچوں کی تربیت کے ضمن میں پیدائش سے لے کر شادی تک کے تمام مراحل کو اسلامی طریقے سے ادا کرنے کا مقصد ایک تو یہی ہے کہ ایک صحیح مسلمان معاشرہ قائم ہو، مسلمان بچوں کو بھی اپنے قول و عمل پر اعتماد ہو اور بچے، جو کہ فطرت کے اصولوں پر پیدا ہوتے ہیں، تصنع اور بناوٹ سے پاک دین فطرت یعنی اسلام پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اولاد کی صحیح تربیت کے بارے میں لکھنے کا دوسرا بڑا مقصد یہ ہے کہ اس وقت اولاد ہم سب کو بہت پیاری ہے۔ اولاد کی خاطر عام طور پر جائز کے علاوہ ناجائز ذرائع سے بھی دولت کمائی جاتی ہے، اپنا تن من دھن اولاد کی خاطر قربان کیا جاتا ہے۔ کوئی اولاد کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے تو والدین کے تن بدن میں غصے اور انتقام کی آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ بچے ذرا بیمار ہوں تو جگہ جگہ ڈاکٹروں کے پاس، جادو ٹونے اور تعویذ دھاگے کرنے والوں کے ہاں بھاگ دوڑ کی جاتی ہے، غرض اپنی جان کی فکر نہیں ہوتی لیکن اولاد کی خاطر ہلکان ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ تو عام معاشرے کا حال ہے۔ تھوڑی بہت دین کی سوجھ بوجھ رکھنے والے بھی حرام سے نہ سہی حلال ذرائع سے ہی اولاد کی ضروریات کو پورا کرنے میں دن و جان سے لگے ہوتے ہیں۔ اچھی تعلیم، اچھے کپڑے، بہترین اسکول، عمدہ سوسائٹی، عمدہ کھانا پینا، رہائش کے لئے بہترین گھر ہر شخص اپنی اولاد کے لئے ضروری تصور کرتا ہے۔ اولاد کی خواہشات کو پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے۔ غرضیکہ اولاد کی دنیا سنوارنے کی بھرپور جدوجہد یہاں بھی ہو رہی ہے۔

ایک وہ طبقہ ہے کہ جو دین کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ سے بھی ناواقف ہے اور روپے پیسے سے بھی محروم ہے۔ روٹی' کپڑا اور مکان جیسی ناگزیر ضروریات میں یہ خود بھی بندھے ہوئے ہیں اور ان کے بچے بھی۔ یہ لوگ خود فاقہ کر لیتے ہیں' لیکن بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ خود تن ڈھانپنے کے لئے چاہے ضروری کپڑے بھی نہ ہوں لیکن بچوں کا تن ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض اولاد کی محبت میں خون پسینہ ایک کر کے انہیں بنیادی ضروریات فراہم کرنے کی تگ و دو یہاں بھی جاری ہے۔

یہاں اب میں بہت اہم بات کہہ رہی ہوں کہ وہ اولاد' جس کی دنیا سنوارنے کی خاطر ہم نے اپنا تن من دھن ایک کیا ہوا ہے' اس لئے کہ یہ ہماری اولاد ہے' ہمارا اپنا تسلسل ہے' ہماری پہچان ہے' ہمارے بعد ہماری جائیداد کی وارث ہے' اس لئے ان کے ساتھ جتنا بھی پیار محبت کر لیں' ان کے لاڈ اور چاؤ چونچلے برداشت کر لیں' حرام و حلال کی تمیز کئے بغیر انہیں آسائشیں فراہم کرتے چلے جائیں' کم ہے۔۔۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اُس وقت کیا ہو گا جب آپ ذات باری تعالیٰ کے حضور کھڑی ہوں گی اور آپ کی اپنی اولاد آپ کے خلاف گواہی دے رہی ہو گی۔ اس دن یہ رشتہ داری (جو کہ اس وقت انتہائی مضبوط سمجھی جاتی ہے) ختم ہو جائے گی' نہ ماں بیٹے کی ہو گی نہ بیٹا ماں کے کسی کام آسکے گا۔

سورۂ عبس میں میدان حشر کی اس کیفیت کو نہایت عبرتناک انداز میں پیش کیا گیا ہے :

﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيهِ○ وَاُمِّهٖ وَاَبِيهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيهِ○﴾

"اس دن آدمی اپنے بھائی' اپنی ماں' اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے فرار حاصل کرنا چاہے گا"۔

جبکہ سورۃ المعارج میں یہ لرزا دینے والے الفاظ وارد ہوئے ہیں :

﴿ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيهِ○ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ○ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ○﴾

"مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو'

اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا، اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلادے"۔

یہ ہے وہاں کی سراسیمگی کا عالم اور افراتفری کا سماں۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ! اے عقلمندو، ان حقائق سے چشم پوشی کرنے کی بجائے عبرت پکڑو! اولوالابصار کون ہیں؟ وہ جن کی ظاہری بصارت کے ساتھ ساتھ باطنی بصیرت بھی روشن ہے، یعنی صحیح مسلمان مرد اور خواتین۔

تو میں اپنی بہنوں سے التجا کرتی ہوں کہ ان ظاہری نگاہوں سے ظاہری چیز یعنی دنیا ہی کو دیکھنا اور دکھانا چھوڑ دیں۔ اور بچوں کی تربیت اس نہج پر نہ کریں کہ وہ آخرت سے بے گانہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کو کہیں "عَدُوٌّ لَّكُمْ" (تمہاری دشمن)، کہیں "فِتْنَةٌ" (تمہارے لئے آزمائش) اور کہیں "زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (دنیوی زندگی کی آرائش و زیبائش) کہا ہے۔ ہمیں خبردار رہنا چاہئے کہ ہماری غلط تربیت انہیں خدا کے ہاں کہیں ہماری دشمن نہ بنادے۔ ہماری بہنوں کو یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ عورتیں اس کی پکڑ میں زیادہ آئیں گی۔ خدا تعالیٰ نے ماں میں مامتا بھی زیادہ رکھی ہے اور وہ محاسبۂ اخروی میں اولاد کی ذمہ دار بھی مَردوں کی نسبت زیادہ ٹھہرائی جائیں گی۔ تو آپ اولاد کی محبت کو خدا کی محبت کے تابع کر کے ان کی تربیت کریں۔ یہی ان کے اور آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔ ورنہ مذکورہ بالا آیات کو ذہن میں رکھیں کہ انصاف کے کٹہرے میں آپ کی اولاد آپ کے خلاف گواہی دے رہی ہوگی کہ اے ربّ! ہمارے بگاڑ کے ذمہ دار ہمارے یہ والدین ہیں جنہوں نے ہمیں غلط راہ پر لگایا، حرام کھلایا، رشوتیں کھلائیں، جھوٹ بولنا، چوری کرنا سکھایا۔ دنیا میں ہر جائز اور ناجائز طریقے سے ہماری آسائشوں، آرام اور راحت کا خیال رکھا، لیکن ہمیں اس دن کے انجام سے بے خبر رکھا۔ نہ ہمیں تیرا ڈر خوف سکھایا اور نہ تیرے نبی کی تعلیمات پر عمل کرنے کو کہا۔ دنیوی اعتبار سے ہمیں بہترین تعلیم دلوائی، بہترین سکولوں اور کالجوں میں داخل کروایا لیکن تیرے قرآن پر عمل تو بہت دور کی بات ہے ہمیں قرآن پڑھنا تک نہیں سکھایا۔ اے رب آج تو ان کی گردن پکڑ لے اور دوزخ میں جھونک دے اور ہمیں بچالے!

خواتین اگر "شہادت علی الناس" کے فریضے کو نہیں سمجھ سکتیں تو یہ تو ضرور ان کی سمجھ میں آ جانا چاہئے کہ ان کے لئے شہادت علی الناس کہاں ضروری ہے؟ باہر نکل کر شہادت علی الناس کے فریضے کو انجام دینا مَردوں کا کام ہے' لیکن گھر کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے اہل خانہ کو اخروی انجام سے خبردار کرنا اور سب سے بڑھ کر اپنی اولاد کی آخرت بنانے کے لئے قدم قدم پر قرآن و حدیث سے رہنمائی حاصل کرنا اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچانے کے لئے اپنا تن من دھن لگا دینا خواتین کی اولین ذمہ داری ہے۔

پہلی قسط میں پیش کردہ آیت قرآنی یہاں دوبارہ لا کر میں اپنا مضمون ختم کر رہی ہوں۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾

اے ایمان والو' اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ!

وما علینا الا البلاغ

ان شاءاللہ العزیز' تنظیم اسلامی کا

۲۱واں سالانہ اجتماع

جمعہ ۴/ اکتوبر تا اتوار ۶/ اکتوبر ۹۶ء

بمقام لیاقت باغ راولپنڈی

منعقد ہو گا۔ اجتماع کا آغاز

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطاب جمعہ سے ہو گا

رفقاء تنظیم اسلامی جمعہ ۴/ اکتوبر کی صبح اجتماع گاہ میں پہنچنے کا اہتمام کریں

المعلن : ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان

دینی اور دنیوی تعلیم کا حسین امتزاج

قرآن کالج لاہور

اعلان داخلہ

برائے بی اے (سال اول)' اور
ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس

- امسال دوسرے کالجوں سے ایف اے پاس کرنے والے طلبہ کے لئے بی اے میں براہ راست داخلہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔
- بی اے کے باقاعدہ داخلے ایف اے کے نتائج کے بعد دس روز کے اندر ہوں گے۔ تاہم داخلہ کے خواہشمند طلبہ ۱۰ ستمبر سے شروع ہونے والی بی اے (سال اول) کی کلاس میں پروویژنل طور پر شامل ہو سکتے ہیں۔
- ایک سالہ رجوع الی القران کورس کے داخلے ستمبر کے آخری ہفتے میں ہوں گے۔
- بی اے اور ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس' ہر دو کلاسز کے لئے ایک ایک میرٹ سکالرشپ کی سہولت موجود ہے۔
- کالج میں کمپیوٹر کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

پراسپکٹس اور داخلہ فارم کیلئے دس روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کریں۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج' اتاترک بلاک 'نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

فون : 8-5833637

نبی اکرمؐ کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری **نجات** کا دار و مدار ہے

اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

مطبوعہ

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

ھدیہ فی نسخہ: ۶ روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا:

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Reg. No. L 7360
Vol. 45 No. 9
September, 1996

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان

کی تازہ ترین تالیف

برِّعظیم پاک و ہند میں

اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل

اور اس سے انحراف کی راہیں

جس میں

- اسلام کے ابتدائی انقلابی فکر اور اس میں زوال کی تاریخ کے جائزے کے بعد
- علامہ اقبال کے ذریعے اس کی تجدید اور مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے ہاتھوں اس کی تعمیل کی مساعی اور ان کے حاصل، اور
- "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ میں ناگزیر تدریج اور اس کے تقاضوں" کے علاوہ
- اس فکر سے انحراف کی بعض صورتوں پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے ——————!

سفید کاغذ پر ۱۰۴ صفحات، مع دیدہ زیب ہارڈ کور — قیمت فی نسخہ /۳۰